سونیا

ایک سوانح

مصنف: رشید قدوائی

مترجم: عبدالعلیم قدوائی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولا، نئی دہلی۔ 110 025

سونیا

سونیا

ایک سوانح

مصنف: رشید قدوائی

مترجم: عبدالعلیم قدوائی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولا، نئی دہلی ـ 110 025

پہلی اشاعت	:	2010
تعداد	:	400
قیمت	:	-/80 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	1355

Sonia—Ek Swaneh

Translated by

Abdul Aleem Kidwai

ISBN :978-81-7587-444-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746 فیکس: 26108159

ای-میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی 110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

امّی، اپّی اور فریدہ کی بے لوث محبت کے نام

فہرست مضامین

عرض مترجم

سونیا کی سوانح عمری میں ہندوستان کی ایک اہم تاریخ ساز شخصیت سونیا گاندھی صدر کانگریس کی سیاسی کارروائیوں پر ایک نوجوان اور ہونہار صحافی رشید قدوائی نے معروضی تاثرات اور تجزیات قلم بند کئے ہیں جس کی ہندوستان کے انگریزی پریس نے خاصی تعریف کی ہے اور اسے نہرو-گاندھی خاندان کی ایک زیرک اور کامیاب خاتون سیاست داں کی ایک قابل داد سوانح سے تعبیر کیا ہے۔ اس کتاب کے ملک کی کئی علاقائی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ اس کے اردو ترجمہ کی ذمہ داری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس خاکسار کو سونپی۔ کسی بھی زبان میں دوسری زبان کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ شستہ اور رواں زبان میں ہو اور تکرار وحشو سے حتی الامکان پاک صاف ہو۔

امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

نومبر 2010

عبدالعلیم قدوائی

دیباچہ

سونیا- ایک سوانح کا پہلا ایڈیشن دسمبر 2003 میں مدھیہ پردیش، راجستھان اور چھتیس گڑھ کے ریاستی الکشنوں میں کانگریس کی زبردست شکست کے بعد شائع ہوا تھا۔ ان تینوں ریاستوں کے رائے دہندگان نے بھارتیہ جنتا پارٹی کو کانگریس کے مقابلہ میں بھاری اکثریت سے اقتدار کی باگ ڈور سونپی۔ یہ اس وقت کے وزیراعظم اٹل بہاری باجپئی اور مرکز میں برسر اقتدار قومی جمہوری محاذ کی بڑی نمایاں کامیابی تھی جس کی بنا پر انھوں نے وقت سے پہلے ہی اپریل مئی 2004 میں ملک کا جنرل الکشن کرایا۔ لیکن الکشن کے نتائج نے ہر ایک کو متحیر کر دیا۔ کانگریس کے زیر قیادت والے محاذ کو الکشن میں کامیابی ملی اور سونیا گاندھی کو غیر معمولی کامیابی اور طاقت نصیب ہوئی۔

اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں گزشتہ دس سال کے اہم سیاسی واقعات اور ڈرامائی تبدیلیوں کے تجزیہ کی میں نے کوشش کی ہے اور اسی کی روشنی میں سونیا گاندھی کی شخصیت اور ان کے جولائی 2008 تک کے کارناموں کی آزادانہ اور غیر رسمی تشریح کی ہے جن سے ان کا ایک نیا کردار ابھر کر سامنے آیا ہے۔

میں کانگریس پارٹی کے ممبروں کی بڑی تعداد کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے سونیا کی شخصیت کے سمجھنے اور کانگریس پارٹی میں ان کے کام کرنے کے طریقوں اور ان کی معاملہ فہمی کے بارے میں بڑے کارآمد، مفید اور دلچسپ مشورے دیے۔ اسی کے ساتھ میں دوسری سیاسی پارٹیوں کے

لیڈروں، دانش وروں، لائق کارگزار افسروں اور سماجی کارکنوں کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے اپنا قیمتی تعاون دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ ان سب ہی حضرات نے لگاتار میری مدد اور حوصلہ افزائی کی۔

میں خاص طور پر اپنے اخبار کے ایڈیٹر اور استاد او یک سرکار، اور اپنے ساتھی صحافیوں مینینی چٹرجی، دیپاین چٹرجی اور ایس راج گوپال کا شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے اپنا قیمتی وقت اور تعاون دیا جس کی وجہ سے میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے باوجود اس کتاب کو مکمل کرسکا۔ میں اپنے دوستوں میں بھارت بھوشن، سنکرشن ٹھاکر، راکیش جوشی، رادھیکا راما سیشن، پرکاش پاترا، نرمل پاٹھک، سوراج تھاپا، پریا سہگل، ہرتوش سنگھ بال، عسکری زیدی، سنیترا چودھری، راما لکشمی، بھاؤدیپ کانگ، شیکھا پریہار، ریشا شرما، نغمہ، اوینا ش دت اور فرحان انصاری کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً میری ہر قسم کی مدد کی اور کارآمد مشورے دیے۔

سب سے بڑھ کر مجھے اپنی شریک حیات ڈاکٹر فرح قدوائی کا ممنون ہونا چاہیے جن کے ہمہ وقت مخلصانہ تعاون اور ہمت افزائی سے مجھے اپنے کام میں بڑی مدد ملی۔ نیز اپنے پیارے عزیزان سعد۔ فازیہ، شہاب۔ سعدیہ، سیف، شمس، عمر، عمیر، عائشہ، صمد، صبور، فلح اور آبان کا بھی تہ دل سے شکرگزار ہوں جو مجھے برابر ہنساتے رہے اور کام کرنے کے سچے جذبوں کو ابھارتے رہے۔

آخر میں میں اپنے ناشر پینگوئن بکس، اور ان کے ایڈیٹروں رنجنا سین گپتا اور شانتانو رے چودھری کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے بڑی دلسوزی اور مستعدی سے میرے کام کی ایڈیٹنگ اور نگرانی کی۔ پریتا موئترا، کرشن چوپڑا اور میرو گوکھلے بھی برابر میرا دل بڑھاتے رہے۔ یہ سب دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

نئی دہلی، جولائی 2008 رشید قدوائی

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کا ایک خود مختار ادارہ ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو زبان میں ادب، سائنس، سماجی علوم، طب اور تاریخ، تہذیب کے علاوہ کئی اور علمی وفنی موضوعات پر بے شمار کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے لائحۂ عمل میں اردو کی ان نادر کتابوں کی اشاعت بھی ہے جو علوم عامہ یا زبان وادب میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں اور عام دسترس سے باہر ہیں۔ اسی طرح دوسری زبانوں میں موجود اہم علمی اور ادبی متون کے تراجم کی اشاعت کی جانب بھی خصوصی توجہ کی ہے۔ کونسل کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو میں موجود علمی وادبی سرمایے کو شائع کر کے اسے محفوظ کر دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں استفادہ کر سکیں اور نئی کتابوں کی اشاعت کر کے اردو کے سرمایے میں ہر ممکن اضافہ کیا جا سکے۔ **سونیا گاندھی کی سوانح عمری** کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

محترمہ سونیا گاندھی ملک کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی سیاسی جماعت کی سربراہ ہیں اور ان کا شمار دنیا کی ان اہم سیاسی شخصیتوں اور اہم ترین خواتین میں ہوتا ہے جن کی زندگی اور شخصیت سے واقف ہونا اردو قارئین کے لیے علمی اور فکری سطح پر سود مند ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں معروف عالمی جریدہ 'فوربس' نے بین الاقوامی شخصیات کی رینکنگ شائع کی ہے جس میں سونیا گاندھی کو نویں نمبر پر رکھا ہے۔ معروف انگریزی صحافی جناب رشید قدوائی کی تحریر کردہ یہ کتاب انگریزی میں 'سونیا گاندھی: اے بایوگرافی' کے عنوان سے شائع ہو کر انگریزی داں

حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ زیرِ نظر اردو کتاب **سونیا گاندھی کی سوانح عمری**، اصل انگریزی کتاب کا سطر بہ سطر یا لفظ بلفظ ترجمہ نہیں بلکہ تلخیص ہے جس میں مترجم نے سہولتِ بیان کے لیے مصنف کے انگریزی متن کی ترتیب کو حسبِ ضرورت تبدیل اور مختصر بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف اور مترجم کے خیالات وتأثرات ان کے ذاتی ہیں جن سے قومی اردو کونسل کا متفق یا غیر متفق ہونا قطعی ضروری نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ کتاب عصر حاضر کی عظیم شخصیتوں کے بارے میں قاری کی عام معلومات میں علمی اضافے کی غرض سے شائع کی جارہی ہے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو تحریر فرمائیں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کیا جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

افتتاحیہ

22/ جولائی 2008 کے لوک سبھا اجلاس میں ڈرامائی واقعات کے بعد ہندوستان اور امریکہ کے مابین نیوکلیائی معاہدہ پر متحدہ ترقی پسند محاذ کی حکومت کو 275 ووٹوں سے اعتماد کی تحریک میں فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت سونیا گاندھی کو اسپیکر گیلری میں ہنستی مسکراتی پر یہ کا نظر آئیں، ان سے آنکھ ملانے کے بعد سونیا نے پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسرور و مطمئن راہل گاندھی کی طرف بھی دیکھا۔ گاندھی کنبہ کے تینوں افراد کو غیر سیاسی وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کی حیرت انگیز کامیابی سے بڑی خوشی ہوئی اور سونیا نے ان کے پاس جاکر مبارکباد دی۔

پارلیمنٹ میں تحریک اعتماد کی ووٹنگ کو سونیا اور منموہن سنگھ کی ذاتی کامیابی سے تعبیر کیا گیا اور ان دونوں کو سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے سیاست دانوں کی صف میں شامل کرلیا گیا۔ ووٹنگ کے نتیجہ کے اعلان ہونے سے تھوڑا پہلے تین بھارتیہ جنتا پارٹی کے ممبران نے دو تھیلوں میں بھرے کرنسی نوٹ ایوان کے سامنے یہ کہہ کر پیش کئے کہ یہ رقم ان کو اس لئے دی گئی ہے کہ وہ ووٹنگ میں حصہ لینے سے باز رہیں۔ اس واقعہ سے پورے ایوان میں کھلبلی مچ گئی۔ مگر سونیا اور منموہن سنگھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور وہ خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہے۔ جب حزب مخالف نے وزیر اعظم کے خلاف نعرے لگا کر ان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے بجائے خود تقریر کرنے کے اپنی لکھی تقریر ایوان کے افسروں کے حوالہ کردی۔ اس کے بعد ہی نتیجہ کا اعلان کیا گیا کہ ایوان کے 275 ممبر اس معاہدہ کو منظور کر کے سرکار پر اپنا اعتماد ظاہر کرتے ہیں اور 256 ممبر اس کی مخالفت

کر کے سرکار پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔اس معاہدہ کی سخت مخالفت بائیں بازو کی پارٹیاں، بھارتیہ جنتا پارٹی اور دیگر مخالف پارٹیاں گزشتہ ایک سال سے کر رہی تھیں اور آخر میں یہ معاملہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔اس موقعہ پر سماج وادی پارٹی کی غیر متوقع حمایت نے سرکار کے حق میں پانسہ پلٹ دیا۔حالانکہ اس سے پہلے ملائم سنگھ یادو اور امر سنگھ سونیا کے سخت مخالف تھے اور امیتابھ بچن اور ان کے خاندان والوں کے گہرے دوست۔انھوں نے بچن اور گاندھی خاندان کے مناقشہ میں بچن کا کھل کر ساتھ دیا تھا،مگر اس نازک موقع پر سونیا نے سماج وادی پارٹی کو اپنی طرف کر کے بائیں بازو اور مخالف پارٹیوں کو سخت زک پہنچائی اور اسی کے ساتھ ہی ملک کی سب سے بڑی اور اہم ریاست اتر پردیش میں کانگریس کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا۔

تحریک اعتماد پر ووٹنگ کے نتیجہ کو سیاسی حلقوں نے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا مئی 2004 میں سونیا گاندھی نے وزارت عظمیٰ کے لئے ڈاکٹر منموہن سنگھ کا نام پیش کر کے سب کو حیرت میں تو ڈال دیا تھا مگر بہت دنوں تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ وہ اپنے غیر سیاسی کردار کی بنا پر نام کے وزیر اعظم ہیں اور خود کوئی آزادانہ فیصلہ نہیں کر پاتے۔2004 اور 2008 کے بیچ میں سونیا کی حکمت عملی اور تدبّر کی وجہ سے منموہن سنگھ کی مخلوط حکومت نے بے شمار چیلنجوں کا سامنا بڑی کامیابی سے کیا، پھر بھی یہ امر واقعہ ہے کہ اس زمانے میں حکومت عملاً افسر شاہی کی رہی، وزیروں میں آپس میں اختلاف اور کشمکش جاری رہی اور انھوں نے پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہی اور اپنی ذمہ داری کے احساس کو اہمیت نہ دی۔سونیا کا زیادہ تر وقت پس پردہ ان جھگڑوں کو نپٹانے اور پارلیمنٹری ضابطوں اور قانون کی بالادستی کو قائم رکھنے میں گزرا۔ان کو نئی تشکیل کردہ نیشنل ایڈوائزری کونسل کا چیرمین بنایا گیا اور انھوں نے اس حیثیت سے کئی قابل قدر کام کئے۔2006 میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ یہ ایک منفعت بخش عہدہ ہے اور اسے پارلیمنٹ کی ممبری کے ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ سونیا نے اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔

راہل گاندھی کو بعض حلقوں نے مستقبل کا وزیر اعظم کہنا شروع کیا مگر اس کا اثر حکومت اور

کانگریس پارٹی کی تنظیم پر نہیں پڑا اور انھوں نے خود بھی اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ان کو کانگریس کا جنرل سیکریٹری بنایا گیا اور انھوں نے کچھ جماعتی اصلاحات بھی لانا چاہیں مگر زیادہ تر ممبران کسی بھی تبدیلی کی مخالفت ہی کرتے رہے ایک گروہ نے ان کا نام 2009 کے الکشن کے بعد وزارت عظمٰی کے لئے پیش کر دیا مگر اس کی کھل کر مخالفت سونیا گاندھی اور خود راہل گاندھی نے اپنی تقریروں میں کی۔ راہل گاندھی کی جھجک اور سیاسی معاملات میں اپنے کو پیچھے رکھنے کی عادت نے بھی ان کی قیادت کے معاملہ کو پیچیدہ بنا دیا، لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی اور حزب مخالف کے کچھ لیڈر یہی کہتے رہے کہ سونیا کی مخالفت بناوٹی ہے اور وہ اپنے بیٹے ہی کو ملک کا آئندہ وزیراعظم بنانا چاہتی ہیں اور اس وقت منموہن سنگھ کو ان کی وفاداری کے عوض نمائشی وزیراعظم بنائے ہوئے ہیں، لیکن یہ امکانی نظریہ سیاسی نقطہ نظر سے کچھ زیادہ وقعت یا وزن نہیں رکھتا۔ اتنے بڑے ملک کے سیاسی عوامل اور پس منظر میں اس قسم کے قیاسات کو مہمل ہی کہا جائے گا۔

سونیا کی زندگی کا مطالعہ اس اعتبار سے پڑھنے والوں کو غالباً زیادہ دلچسپ محسوس ہوگا۔

پہلا باب

آربیسو سے ایک لمبا سفر

سونیا شمالی اٹلی کے ایک چھوٹے شہر آربیسو میں 9/دسمبر 1946 کو پیدا ہوئیں۔ وہ اپنی تین بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھیں اور اپنی خصوصیات کی بنا پر گھر کی شہزادی، سینیر ینٹولا یا سنڈریلا کہلائی جاتی تھیں۔ وہ اپنی دونوں بہنوں ناڈیا اور انوشکا سے اس لحاظ سے مختلف تھیں کہ وہ اپنے کو لئے دیے رکھتی تھیں اور اپنے منصوبوں کو بہت کم ظاہر کرتی تھیں۔ آربیسو شہر کی تھوڑی بہت ترقی جنگ کے بعد شمالی اٹلی کی خوشحالی کی بنا پر اور 1950 میں اپارٹمنٹ بلاکس اور اچھے گھروں کی وجہ سے تو ہوگئی تھی مگر سونیا کے لئے وہ ایک معمولی اور صرف نچلے متوسط طبقہ کے لئے مناسب جگہ تھی۔ ایسی ہی پست رائے ان کی سیز ینٹولا جیسے صنعتی شہر کے بارے میں تھی جہاں ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔

وہ پڑھنے لکھنے میں اچھی تھیں خاص کر زبانوں سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، لیکن ان کو کوئی امتیاز حاصل نہ ہو پایا، وہ اسپینی، روسی اور فرنچ زبانوں میں بڑی روانی سے گفتگو کر لیتی تھیں اور اب ہندوستان میں انھیں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

ان کے والد اسٹیفینو نے اپنی لڑکیوں کو روسی زبان کی تعلیم دی۔ انھوں نے جرمن فوج میں شامل ہو کر روس کی لڑائی میں حصہ لیا اور کئی برس جنگی قیدی کی حیثیت سے ولادیمیر اور سوز دال کے

روسی جیلوں میں گزارے۔ تین روسی عورتوں - نادیا، انوشکا اور سونیا - نے جیل سے نکل بھاگنے میں ان کی بڑی مدد کی، شکرگزاری کے طور پر انھوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کے نام ان ہی روسی خواتین کے نام پر نادیا، انوشکا اور سونیا رکھ دیے۔ وہ خود کو اسٹیفینو یا ایوجینیو کہلانا پسند کرتے تھے۔ اپنے انتقال کے وقت یعنی 1988 تک روسی زبان، روسی تمدن اور روسی کھانوں کو یاد کرتے رہے۔ وہ ایک جفاکش اور منظم انسان تھے جنھوں نے مشکلات کا سامنا کر کے زندگی میں کامیابی حاصل کی اور ان خوبیوں کو بڑے سلیقہ سے اپنی لڑکیوں کی زندگی میں سمو دیا۔ وہ ایشیا گو سے وینیٹو علاقہ کے شہر آربیسنو میں ایک معمولی معمار کی حیثیت سے آ کر آباد ہوئے اور اپنی دیانت داری اور محنت سے ایک چھوٹا موٹا تعمیرات کا کاروبار قائم کر لیا اور اپنے خاندان کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرنے لگے۔

اسٹیفینو غیر ملکیوں کو پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے اپنی لڑکیوں کو روایتی کیتھولک عیسائی مذہب اور معاشرت کے مطابق پالا پوسا۔ جب سونیا نے انھیں ہندستانی وزیراعظم کے بیٹے سے شادی کرنے کے بارے میں بتایا تو وہ ان سے اتنا ناخوش ہو گئے کہ ان کی شادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ انھیں یقین تھا کہ یہ شادی جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ سونیا کے ماموں میریو پریڈیبوں نے 25رفروری1968 کو سونیا گاندھی کی سول میرج کے مراسم ادا کیے۔

لیکن سونیا کی حکم عدولی سے باپ بیٹی کے عام تعلقات پر کوئی برا اثر نہیں پڑا اور جب راجیو گاندھی آربیسنو آ کر ان سے ملے تو وہ ان سے خوش ہو گئے۔ مگر 82-1981 میں جب راجیو گاندھی ہندوستان کی عملی سیاست میں داخل ہوئے تو وہ تشویش میں پڑ گئے۔ وہ ہندوستان کبھی نہیں آئے مگر یہاں کے سیاسی حالات پر اچھی نظر رکھتے تھے اور یہاں پھیلی ہوئی مذہبی منافرت اور تعصب سے پریشان رہتے تھے۔ آربیسنو میں ان کے دوستوں کا کہنا تھا کہ انھیں خطرہ تھا کہ ان کی بیٹی اور داماد کو متعصب جنونی کوئی نقصان نہ پہنچا دیں اور اسی لئے انھوں نے کبھی سونیا گاندھی کو ہندستانی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی۔

اپنے مزاج کی سختی اور اصول پرستی کی وجہ سے اسٹیفینو کے اپنے گھر والوں خصوصاً بیوی پاؤلا کے ساتھ اکثر جھگڑے ہوتے رہتے تھے جن میں سونیا اپنی ماں کا ساتھ کھل کر دیتی تھیں۔

سونیا نے خود اعتراف کیا ہے کہ بچپن میں وہ خاصی شریر اور اپنی مرضی چلانے والی لڑکی تھیں اور گھنٹوں پڑوسی لڑکوں کے ساتھ فٹ بال اور ہاپ اسکوچ کھیلا کرتی تھیں۔ وہ خود ٹیچر بننا چاہتی تھیں مگر ان کی ماں چاہتی تھیں کہ وہ کسی ایسے پیشے کو اختیار کریں جس میں زیادہ پیسہ ملے۔

سونیا کے بچپن کے دوست جوسٹو مافیو بتاتے ہیں کہ سونیا بہت جلد مشتعل ہو جاتی تھیں چنانچہ انھوں نے کئی مرتبہ ان پر اٹلی، روسی اور جرمن زبان کی موٹی لغت پھینک کر ماری، مگر انھوں نے سونیا کے بارے میں اور کچھ نہیں بتایا اور یہی جھجک آر بیسو کے ان تمام لوگوں میں پائی گئی جو سونیا اور ان کے خاندان کو جانتے ہیں۔ 1998 میں ہندستانی صحافیوں کا ایک وفد آر بیسو گیا، اُسے سونیا کی ایک پڑوسی ہم جماعت لڑکی نے صرف یہ بتایا کہ سونیا ایک اونچے سماجی طبقہ سے تعلق رکھنے والی ایک اچھی عورت ہے اور اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ یہاں سے پندرہ کلومیٹر دور گیاد ینو کے ایک فیشن ایبل کالج میریا آزیلیٹرائس کانوینٹ میں پڑھنے کے لئے چلی گئی تھی۔

اس کانوینٹ میں کام کرنے والی سسٹر ڈومینکا کو وہاں پڑھنے والی سونیا اچھی طرح یاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پڑھنے کی بہت زیادہ شوقین نہ تھیں لیکن وہ درجہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی تھیں اور امتحان میں بہرحال کامیاب ہو جاتی تھیں۔ وہاں ایک دوسری کام کرنے والی سسٹر انا میریا نے ان کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ سونیا اسکول کی کسی تقریب میں شرکت کے لئے آئیں، ڈنر شروع ہونے ہی والا تھا کہ ایک دم ان کو یاد آیا کہ انھیں تو اپنے خاص مہمان راجیو گاندھی کے ساتھ ڈنر کھانے کے لئے فوراً جانا ہے چنانچہ وہ چلی گئیں۔ رسالہ فرنٹ لائن کے نامہ نگار دیجو ناروانے کو انھوں نے بتایا کہ سونیا جوڑ توڑ میں دلچسپی رکھتی تھیں اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ وہ سیاسیات میں ضرور کامیاب ہوں گی۔

1965 کے شروع میں ان کے والد کی مالی حالت اتنی اچھی ہو چکی تھی کہ وہ سونیا کے کیمبرج

کے تعلیمی اخراجات آسانی سے برداشت کر سکتے تھے اور ان کے جاننے والے دوستوں نے یہ بتایا کہ 1980 میں جب راجیو گاندھی نے ہندستانی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اس وقت ان کا معیار زندگی خاصا اونچا ہو چکا تھا اور ان کا کاروبار اچھا چل رہا تھا مگر ہندوستان میں ان کی دولت اور خوشحالی کے بارے میں مبالغہ آمیز اور مشکوک خبریں مشہور کر دی گئیں، جن کی تحقیق کے لئے نہرو خاندان کے مخلص دوست محمد یونس خاں کچھ اور لوگوں کے ساتھ جب دو منزلہ مینو ہاؤس پہنچے اور پڑوس میں رہنے والے کچھ ان لوگوں سے ملے جو تعمیرات کے پیشہ سے منسلک تھے، ان لوگوں سے ملنے کے بعد انھوں نے یہ تاثر ظاہر کیا ''میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ گھرانہ اچھے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور ہندوستان میں مسٹر اسٹیفینو کے الف لیلوی مکان اور لاکھوں کی دولت کے جو افسانے مشہور ہیں وہ بالکل لغو اور غیر مستند ہیں''۔

سونیا کی بہن اور بھانجی آربیسنو کے ایک تجارتی کامپلکس گر بولا ڈی ریولٹا میں قدیم نوادرات کی ایک دکان ایٹنیسا اچھی طرح سے چلا رہی ہیں جس میں ہندوستان کی بھی کچھ چیزیں مثلاً تنجور کی تصویریں، بیکانیر کی چاندی کی مصنوعات اور قیمتی و دیدہ زیب شالیں فروخت ہوتی ہیں۔

اسی دکان کی آڑ لے کر سونیا کے مخالف ڈاکٹر سبرامنیم سوامی نے اُن کے خلاف ہندستانی نوادرات کی ہیر پھیر اور غیر قانونی برآمدات کا الزام لگایا۔ وزیر اعظم، وزیر داخلہ، سی. بی. آئی. اور دیگر اداروں کو خط لکھے اور دہلی ہائی کورٹ میں متعدد شکایتیں داخل کیں جن پر عدالت نے ضابطہ کے مطابق مرکزی حکومت اور متعلقہ اداروں کو نوٹس بھی بھیجے مگر کانگریس نے ان الزامات کو ذرا بھی قابل توجہ نہیں سمجھا اور ڈاکٹر سبرامنیم کے الزامات کو بے اصل اور مضحکہ خیز قرار دیا۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر سوامی دوستی اور دشمنی دونوں میں بڑے انتہا پسند سمجھے جاتے ہیں اور ان سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ کانگریسی حلقوں نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر سبرامنیم کو یہ نہیں معلوم ہے کہ سونیا گاندھی، اندرا گاندھی کے زمانے میں اس کمیٹی کی ممبر بنائی گئی تھیں جو ملک میں

آنے والے معزز غیر ملکی مہمانوں کے لئے سرکاری تحفے خریدتی تھی اور وہ خود اعلیٰ جمالیاتی ذوق اور آرٹ کی دلکش مصنوعات کو پرکھنے اور چُننے کی اہلیت رکھتی ہیں چنانچہ ان کے پاس عمدہ تصویروں، ملبوسات وتزئین وآرائش کی مصنوعات کا بڑا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ سونیا نے فن پاروں کی اہمیت کو جانچنے اور محفوظ رکھنے کا باقاعدہ کورس بھی مکمل کیا ہے۔

فرنٹ لائن کے نامہ نگار ویجو ناروانے کا کہنا ہے کہ سونیا گاندھی کو اپنی بہن کی دکان کا محل وقوع کاروباری نقطۂ نظر سے پسند نہیں آیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دکان آربیسنو کے مضافات کے بجائے روم یا ملان میں ہوتی تو زیادہ چلتی، انھوں نے مسکرا کر یہ بھی کہا ''یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی سوئیڈن کا فرنیچر دہلی میں بیچنے کی بجائے وہاں سے دور کسی گرد آلود مضافاتی بستی یا کالونی میں اس کی دکان کھولے''۔

ڈاکٹر سوامی نے سونیا کے ماضی کو بھی کریدنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر سونیا پر الزام لگایا کہ وہ 1965 میں روسی خفیہ ایجنسی کے قائم کردہ لیناکس کک اسکول کیمبرج میں انگریزی پڑھتی تھیں۔ یہ اسکول ان کے کیمبرج چھوڑنے کے بعد بند ہوگیا، مگر کیمبرج کے ذمہ دار سختی سے اس الزام کی تردید کرتے ہیں۔ سرکاری اطلاعات کے بموجب یہ اسکول 1961 میں مسٹر جان لیناکس کک سابق استاد بیل اسکول کیمبرج نے قائم کیا تھا اور اس کو بڑی ترقی دینے کے بعد جب 1985 میں وہ ریٹائر ہونے لگے تو اس اسکول کو اینگلو ورلڈ ایجوکیشن لمیٹیڈ نے خرید لیا جو اس طرح کے بہت سے اسکول دنیا بھر میں چلاتے ہیں۔

کیمبرج کے تعلیمی دور میں سونیا ایک انگریز گھرانہ میں روپیہ دے کر بطور مہمان رہتی تھیں، انہیں گھر کی یاد ستایا کرتی اور انگریزی زبان سے نامانوسیت کی وجہ سے بھی وہ پریشان رہا کرتی تھیں، اپنی پریشانیوں کا ذکر سونیا نے اپنی کتاب ''راجیو'' میں کیا ہے۔

اطالوی کھانے کی تلاش میں وہ ایک یونانی ریسٹورینٹ ''ورسٹی'' پہنچیں، کیونکہ انھیں کوئی اطالوی کھانے پینے کی دکان نہ مل سکی اور وہیں ان کی ملاقات راجیو گاندھی سے ہوئی۔ وہاں ہر شام

کیمبرج کے کچھ ہشاش بشاش طالب علم کھانے پینے کے لئے جمع ہوتے تھے، ان ہی میں سے ایک بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور دلکش معصوم مسکراہٹ والے نوجوان (راجیو) سونیا کی نظروں میں سما گئے۔

سونیا سے راجیو گاندھی کا تعارف ان دونوں کے ایک مشترک جرمن دوست کرسچین نے ایک دن لنچ کے دوران کرایا۔ کرسچین اطالوی زبان خوب فراٹے سے بولتے تھے۔ اس منظر کی نقشہ کشی سونیا نے اپنی کتاب میں یوں کی ہے: ''پہلی دفعہ دور سے ہم دونوں کی نظریں ملیں، مجھے اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوا اور میں پہلی نظر میں ان کی محبت کا شکار ہوگئی۔ بعد میں راجیو نے مجھے بتایا کہ ان کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی''۔ اس وقت ایک اور طالب علم طاہر جہانگیر راجیو گاندھی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ان کا بیان ہے کہ ''جب سونیا ان کے میز کے پاس سے گزریں تو ہر طرف خاموشی چھا گئی، جب گفتگو پھر شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ راجیو اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے اس میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں، ان کے چہرہ پر مسرت آمیز شیفتگی پھیلی ہوئی تھی، پھر انھوں نے کاغذی نیپکن پر پنسل سے کچھ اشعار لکھنا شروع کئے پھر ریسٹورینٹ کے لمبے تڑنگے خوش رو مالک چارلس اینٹونی سے فرمائش کی کہ وہ خود جاکر اشعار والے نیپکن کے ساتھ کچھ خوبصورت پھول سونیا مینو کو پیش کریں''۔

جب راجیو گاندھی ہندوستان کے وزیراعظم ہوئے تو چارلس ایک ہفتہ کے لئے اپنے خرچ پر ہندوستان گھومنے آئے، مگر انھیں دہلی کے ہوائی اڈے پر روک لیا گیا کیونکہ ان کے پاس ہندوستان کا ویزا نہیں تھا۔ جب ان سے پوچھ گچھ کی گئی تو انھوں نے یہ جواب دیا ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ گاندھی کے دوست کو بھی ویزا لینا پڑے گا''۔ ظاہر ہے کہ اس جواب کو ہوائی اڈہ کے ذمے داروں نے تسلیم نہیں کیا مگر ان کو فون کرنے کی اجازت دے دی۔ آدھے گھنٹے کے اندر کئی ایمبسیڈر کاریں ہوائی اڈہ پر پہنچ گئیں اور چارلس کو عزت کے ساتھ ریس کورس روڈ پر پہنچا دیا گیا۔ چارلس نے راجیو گاندھی اور سونیا کے ساتھ پورا ہفتہ ہنسی خوشی گزارا۔ دہلی اور آگرہ کے قابل دید

مقامات دیکھنے کے بعد وہ بحر ہند میں واقع ٹراپیکل جزیرہ بھی تفریح کرنے گئے۔

کیمبرج میں راجیو گاندھی کا وقت اپنے دوستوں ارون سنگھ، دیپ کول، پاکستانی نژاد محمود اور اینڈرسن کے ساتھ سیر وتفریح میں اچھا کٹا۔ ان لوگوں نے ساجھا کر کے گھومنے کے لئے ایک پرانی والکس ویگن کار خریدی جو اکثر چلتے چلتے خراب ہو جاتی اور پھر راجیو اس کو ٹھیک کیا کرتے۔ ان کے ایک اور ساتھی رابن سرین بتاتے ہیں کہ راجیو کو انجن اور کار کے کل پُرزوں سے گہری دلچسپی تھی اور ان کے ساتھ سفر بڑا خوشگوار رہتا تھا۔ کیمبرج میں سونیا 59 ٹینیسن روپر اپنی ایک 55 سالہ اطالوی ہم وطن پیٹنا کے مکان میں روپیہ دے کر بطور مہمان ایک لمبے عرصے تک رہیں اور پھر کچھ مدت کے لئے 65 لینس فیلڈ روڈ کے ایک مکان میں بھی رہیں۔

کیمبرج میں سونیا راجیو گاندھی کے ساتھ اکثر فلم دیکھنے جایا کرتی تھیں، چنانچہ ان لوگوں نے مل کر پہلی فلم ستیہ جیت رے کی پاتھیر پنچالی دیکھی۔ راجیو ان کو دریا کی سیر کرانے اور ناچ کے کلب بھی لے جاتے تھے۔ لیکن دونوں شراب سے محترز رہتے اور چائے کا مزہ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ راجیو نے سونیا کو تاج محل دکھانے کی پیشکش کی اور انھیں یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ وہ اس کے بارے میں بہت کم جانتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس بے مثال عمارت اور شاہجہاں اور ممتاز محل کی محبت کی داستان انھیں سنائی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ بہت دنوں تک سونیا کو راجیو گاندھی کے ہندستانی سیاست سے اہم تعلق اور رشتہ کا ٹھیک سے علم نہ ہوا۔ ان کی ایک سہیلی نے ایک دفعہ مسز اندرا گاندھی کے دورہ انگلستان کے موقع پر ان کی ایک تصویر سونیا کو دکھائی جس سے انھیں پتہ چلا کہ راجیو گاندھی ہندوستان کے سب سے نمایاں سیاسی گھرانے کے فرد ہیں۔

سونیا سے ملاقات کے تقریباً ایک سال بعد راجیو گاندھی آر بیسنو میں مینو ہاؤس پہنچے۔ دن بھر سٹی سینٹر میں گھومنے کے بعد شام کو وہ سونیا کے والد اسٹیفنیو سے ملے اور بلا جھجک سونیا سے شادی کی درخواست پیش کر دی جسے سن کر اسٹیفنیو دنگ رہ گئے۔ وہ غیر ملکی افراد کو پسند نہیں کرتے تھے، مگر وہ

سمجھ گئے کہ راجیو سونیا سے شادی کر کے رہیں گے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا جو سونیا کو ہندوستان میں رہنے کے بعد پیش آ سکتے تھے۔ پھر انھوں نے راجیو اور سونیا کو ہدایت کی کہ وہ ایک دوسرے سے ایک سال تک بالکل نہ ملیں اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ وہ آئندہ زندگی ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ایک سال کی علاحدگی کی شرط سے دونوں کو تکلیف تو پہنچی مگر اس سے ان کی محبت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ اسٹیفنیو کو اس مدت کے گزر جانے کے بعد اپنا وعدہ پورا کرنا پڑا مگر ان کے پندار نے انھیں شادی میں حصہ لینے سے باز رکھا۔

اندرا گاندھی کی رائے اس معاملہ میں بالکل مختلف تھی۔ راجیو ان کو باقاعدگی سے ہر خط میں سونیا کے بارے میں لکھتے رہتے تھے۔ جب وہ جواہر لعل نہرو پر نمائش کی افتتاح کے لئے لندن آئیں تو انھوں نے سونیا سے ملنے پر آمادگی ظاہر کی، مگر سونیا پر بڑی گھبراہٹ طاری ہوئی۔ یہ ملاقات انڈیا ہاؤس میں ہوئی اور دوسری ملاقات ہندستانی ہائی کمشنر کی قیام گاہ پر۔ اندرا گاندھی اور راجیو دونوں کو سونیا کے جذبات کا اندازہ تھا، چنانچہ اندرا گاندھی نے ان سے فرانسیسی زبان میں بات چیت کی جس سے سونیا کا اعتماد بحال ہوگیا۔ اس ملاقات کے بارے میں انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ''اندرا جی جانتی تھیں کہ مجھے فرنچ انگریزی سے زیادہ اچھی آتی ہے اس لئے انھوں نے اسی زبان میں مجھ سے میری تعلیم، زندگی کے حالات اور رجحانات دریافت کئے اور اپنی مثال دے کر مجھے نصیحت کی کہ میں ان سے بات چیت بغیر کسی جھجک اور ڈر کے کروں''۔ اندرا جی کے اس مشفقانہ رویہ نے ان کی ہونے والی بہو پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔

سونیا 13 رجنوری 1968 کو دہلی پہنچ گئیں اور بارہ دن بعد ان کی منگنی کی سادہ تقریب منعقد ہوئی۔ ان کے قیام کے لئے محمد یونس اور ٹی این کول نے جو اندرا گاندھی کے خاص مقرب تھے، تجویز پیش کی کہ وہ امیتابھ بچن اور تیجی بچن کی مہمان رہیں۔ یہ رائے اندرا گاندھی، راجیو اور امیتابھ بچن سب ہی کو بہت پسند آئی۔ اس طرح امیتابھ سونیا کے پہلے دوست بن گئے۔

شادی 25 رفروری 1968 کو 1، صفدر جنگ روڈ کے لان پر سادگی سے سول میرج کے ضابطوں

کے تحت ہوئی۔ مہندی کی رسم بچن کے گھر پر ہوئی۔ راجیو سفید ریشم کی شیروانی، گلابی بھرت پوری صافہ، چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس تھے۔ سونیا ہلکے گلابی رنگ کی کھدر کی ساری پہنے ہوئی تھیں مگر ان کے جسم پر کوئی زیور نہیں تھا۔ البتہ کشمیری رواج کے مطابق پھول کے ہاروں اور زیورات سے ان کو خوب سجایا گیا تھا۔ سنجے گاندھی بھی سفید شیروانی اور گلابی صافہ میں ملبوس تھے۔ شادی کے بعد ہلکے پھلکے فواکہات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ رات کو حیدرآباد ہاؤس میں ایک پُر تکلف ڈنر ہوا جس میں تقریباً ڈھائی سو مہمانوں نے شرکت کی۔ دوسرے دن اندرا جی کی طرف سے اشوکا ہوٹل میں شاندار ضیافت ہوئی جس میں ایک ہزار مہمانوں نے بہترین ہندستانی، کشمیری اور اطالوی کھانوں کا لطف اٹھایا۔

1969 میں سونیا کا اسقاط حمل ہوا جس کی وجہ وہ یوگ اور ورزش کی زیادتی بتاتی ہیں۔ ان کو دوسروں کے ساتھ یوگ کے آسن سوامی دھیریندر برہمچاری سکھاتے تھے۔ مگر اگلے سال جون 1970 میں راہل کی پیدائش نے سونیا کو اس صدمہ سے نجات دلادی۔ اس زمانے میں بقول سونیا اندرا گاندھی ان کی حقیقی ماں بن گئیں اور ان کی غیر معمولی خاطر اور نگہداشت کی۔ یہ زمانہ اندرا کے عین اقتدار اور مقبولیت کا تھا مگر نہ تو انھیں اور نہ سونیا کو کبھی بھی کسی قسم کی غلط فہمی یا کشیدگی کا احساس ہوا۔

سونیا نے 1986 میں گارجین نیوز سروس کے نمائندہ ایرک سلور کو اپنے اور ان کے تعلقات کے بارے میں یہ بتایا ''میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی کہ میں نے ہمیشہ اپنے شوہر کو اپنے سے برتر اور ان کی ماں کو سب سے زیادہ مرتبہ اور حیثیت رکھنے والی خاتون سمجھا''۔ اسی طرح ایک اطالوی رسالہ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے اندرا گاندھی کو اپنی حقیقی ماں کی طرح شفیق قرار دیا اور ان کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کو ایک یادگار خوشگوار تجربہ بتایا۔ انھوں نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ شادی کے بعد جب ان کی والدہ اٹلی واپس جانے لگیں تو انھیں تنہائی اور سنجیدگی کا احساس ہوا۔ جب وہ انھیں ہوائی اڈے پر الوداع کہنے کے بعد گھر واپس آئیں تو انھیں اندرا گاندھی کا لکھا ہوا یہ رقعہ ملا ''میں تم کو خوش آمدید کہتی ہوں اور یہ بھی کہ ہم سب تم کو چاہتے ہیں''۔

پھر بھی وزیر اعظم کی بہو ہونے کے بنا پر ان کو بہت سی مشکلات اور الجھنوں کا شکار ہونا پڑا۔

جب بھی وہ گھر سے باہر قدم نکالتیں انھیں نامانوس ماحول، اجنبی نظروں اور حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ انھیں ہندستانی کھانا اور لباس اچھا نہیں لگتا تھا، مگر اندرا اور راجیو نے ان کو اس بات پر کبھی نہیں ٹوکا، البتہ وہ لوگ ان سے ضرور کہتے تھے کہ کھانے کی میز پر ہر جگہ ہندی بولو۔ آہستہ آہستہ سونیا کو ہندستانی کھانے اچھے لگنے لگے اور آج بھی 10 جن پتھ میں پاستا، لسا گنا اور اسپا جینی جیسے اطالوی کھانے میز پر بہت کم نظر آتے ہیں۔

اوشا بھگت، پوپل جیکر اور محسنہ قدوائی جو اندرا گاندھی کے مقرب حاضر باشوں میں تھیں کا کہنا ہے کہ سارے گھریلو معاملات اندرا گاندھی نے سونیا کو سونپ رکھے تھے اور وہ انھیں بڑی تندہی سے انجام دیتی تھیں۔ وہ اندرا جی کے دوستوں کی بڑی عزت کرتی تھیں، انھوں نے بڑی جلدی اندرا کے مزاج کو سمجھ لیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اٹلی میں ان کی پرورش ایسے قدامت پسند کنبہ میں ہوئی جہاں آپس کے میل جول اور خاندانی قدروں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اندرا کو سونیا کی سادگی، لبھانے والا اخلاق اور خوش مزاجی بڑی پسند تھی۔ انھیں کبھی یہ شکایت بحیثیت ایک ساس ان سے نہیں پیدا ہوئی کہ وہ راجیو پر اپنا قبضہ جمانا چاہتی ہیں یا انھیں ان سے الگ کرنا چاہتی ہیں۔ ساریوں کے انتخاب، مہمانوں کے لئے تحفوں کی خریداری اور وزیر اعظم کی قیام گاہ پر آنے والے مہمانوں کی خاطر داری میں انھیں سونیا سے بڑی مدد ملی۔ چنانچہ جب وہ لندن دورہ پر گئیں تو انھیں سونیا کا تجویز کردہ راجستھانی گرم کپڑے کا کوٹ بڑا پسند آیا۔ اسی طرح ان کے بہت سے ملنے والوں نے کامن ویلتھ وزرا کی کانفرنس کے یوم افتتاح میں اندرا گاندھی کی کشمیری بارڈر والی سنہری ساری کی بڑی تعریف کی جس کا انتخاب سونیا نے ہی کیا تھا۔

ساس بہو کے روایتی تعلقات کے بارے میں سونیا نے ایک انٹرویو میں اپنے تاثرات کھل کر اس طرح بیان کئے: ''میری بہت سی دوستوں کو اپنی سسرال والوں سے طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں مگر مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا، مجھے بچپن ہی سے سکھایا گیا کہ شوہر اور اس کی ماں کی ہر طرح عزت کرنا چاہئے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ 26-25 سال تک اپنی ماں سے محبت

کرنے والا شوہر ایک دم سے اپنی ساری محبت اپنی بیوی کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اپنی ساس کو بھی موقع دینا چاہئے کہ وہ بیٹے اور بہو کے ساتھ ان کی نئی زندگی میں اپنے لئے عزت کی جگہ بنا سکے۔ میں اور ممی (اندرا گاندھی) ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، میں ان کا لحاظ اور عزت کرتی ہوں اور وہ میرے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آتی ہیں اسی لئے ذرا سی بھی آویزش یا تلخی نہیں پیدا ہوتی''۔

اندرا جی کے خیالات بھی کچھ اسی قسم کے تھے چنانچہ وہ اپنے مخلصوں اور معتمدوں کے سامنے سونیا کی بہت تعریف کرتی رہتی تھیں، انھیں تعجب ہوتا تھا کہ ان کے کہے بغیر سونیا ان کی مرضی سمجھ جاتی تھیں۔ راجیو کے سیاست میں آنے کے بعد سونیا نے 1981 سے جینس اور اسکرٹ چھوڑ کر ساری، قمیص اور شلوار پہننا شروع کر دیا تھا جس سے اندرا جی بے حد خوش ہوئیں۔

اسی طرح سونیا کے سنجے گاندھی سے بڑے شگفتہ تعلقات تھے، وہ ان کے ساتھ گھومنے اور آئس کریم کھانے جایا کرتی تھیں۔ راہل کی پیدائش سے قبل راجیو کی غیر حاضری کے دوران سنجے سونیا سے ہنسی مذاق کرتے اور ان کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتے تھے۔

سونیا 20/جون 1975 کو عملی سیاست سے پہلی بار روبرو ہوئیں اور دہلی بوٹ کلب میں ایک لاکھ آدمیوں کے ہجوم کے سامنے آئیں۔ یہ وہ موقع تھا جب الہ آباد ہائی کورٹ نے اندرا جی کی پارلیمنٹ میں رائے بریلی سے کامیابی کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ سنجے گاندھی نے اس موقع پر ایک بڑے جلسہ کا اہتمام کیا تھا اور اس پر زور دیا کہ گھر کے سبھی افراد اس میں شریک ہوں، چنانچہ کھادی میں ملبوس سونیا، راجیو، سنجے اور مینکا اسٹیج پر اندرا گاندھی کے پیچھے بیٹھے۔ سونیا گاندھی کو حیرت تھی کہ ایسے نازک موقع پر اندرا گاندھی کی شخصیت نے پورے مجمع کو مسخر کر رکھا تھا اور وہ ان کی حمایت میں نعرے لگا رہا تھا۔

ایمرجنسی کے خاتمہ اور 1977 میں جنرل الکشن میں کانگریس کی ہار کے بعد راجیو اور سنجے گاندھی

میں سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے۔ راجیو سنجے کو اندرا گاندھی کے زوال کا ذمہ دار سمجھتے تھے اور وہ ایمرجنسی میں سنجے گاندھی کی من مانی اور غیر دستوری حرکتوں کے سخت مخالف تھے۔ گاندھی گھرانے کے بہت سے دوستوں کا خیال ہے کہ راجیو اور سونیا دونوں کو اپنی مرضی کے خلاف سیاست میں زبردستی حصہ لینا پڑا۔ راجیو کی محبت میں سونیا ہندوستان آئیں اور اسی محبت کی بنا پر انھوں نے راجیو کو 1980 میں سیاست میں بھیجا تاکہ وہ اپنی ماں کی مدد کر سکیں اور پھر 1984 میں اپنی دلی منشا کے خلاف ان کو وزیر اعظم کا عہدہ بطور ایک فرض کے سنبھالنے پر آمادہ کیا۔ کئی سال بعد 98-1997 میں خود سیاست میں اپنا فرض نبھانے کے لئے آئیں کہ ان کے محبوب شوہر کی پارٹی کہیں ختم نہ ہو جائے۔

گاندھی گھرانے کے لئے ایمرجنسی کے بعد کا زمانہ بڑا صبر آزما اور سخت ثابت ہوا۔ اندرا گاندھی پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے، انھیں صفدر جنگ روڈ کی قیام گاہ کو چھوڑ کر 12 ر ولنگڈن کریسنٹ کے ایک چھوٹے مکان میں منتقل ہونا پڑا، مگر اسی چھوٹے مکان میں ساس بہو ایک دوسرے سے بہت نزدیک ہو گئیں۔ اندرا گاندھی نے بار بار محمد یونس خاں سے کہا کہ وہ راجیو اور سونیا کی مدد اور عملی تعاون کے لئے ان کی بہت شکر گزار ہیں۔ یہ تکلیف دہ صورت حال جنوری 1980 میں ختم ہوئی جب اندرا گاندھی کو عام انتخابات میں زبردست فتح حاصل ہوئی اور کنبہ پھر صفدر جنگ روڈ میں پہنچ گیا۔ 23 ر جون 1980 کو سنجے گاندھی کی المناک موت ایک ہوائی جہاز حادثہ میں ہو گئی۔ اس وقت راجیو گاندھی اور سونیا اٹلی میں تھے۔ حادثہ کے بعد یہ دونوں واپس آئے۔ سنجے گاندھی کی موت کا اندرا گاندھی کو بڑا صدمہ ہوا۔ وہ ان کے معتمد اور مشیر تھے اور ہر معاملہ میں ان کے کام آتے تھے۔ خود سونیا کو بھی بڑا رنج ہوا۔ اندرا گاندھی کے دکھے دل کو مزید چوٹ مینکا کے تلخ اور ناشائستہ رویہ سے پہنچی۔ اس خاندانی جھگڑے سے سونیا کے تعلقات اندرا گاندھی سے مزید گہرے ہو گئے۔ سونیا نے افسوس کے ساتھ یہ بات نوٹ کی کہ اندرا گاندھی اپنی عمر سے زیادہ سن رسیدہ اور متفکر رہنے لگیں۔ راتوں کو اٹھ کر لان میں ٹہلا کرتیں، وہ اپنے ننھے

پوتے ورُن کی غیر حاضری کو بھی خاصا محسوس کرتی تھیں۔

ایسے نازک وقت میں سونیا گاندھی نے بہو سے بڑھ کر بیٹی کا کردار ادا کیا جس کی شہادت پوپل جیکر اور محسنہ قدوائی نے دی۔ وہ ان کے کھانے ناشتے کی خاص فکر کرتیں اور جب وہ لمبے دورے سے واپس آتیں تو ان کے پیروں کی مالش کرتیں اور گرم پانی سے سینکتی تھیں۔ انھوں نے صحیح اندازہ لگایا کہ اس وقت غمزدہ ماں کو بیٹے کی خدمات درکار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی محبت کی قربانی دے کر راجیو کو الکشن میں حصہ لینے کے لئے جون 1981 میں بھیجا، اور وہ امیٹھی کے ضمنی الکشن میں لوک سبھا کے ممبر منتخب ہو گئے۔ سیاسی مصروفیات کی بنا پر ہوا بازی، فوٹو گرافی وغیرہ تفریحی مشاغل چھوڑنے کے ساتھ راجیو کو سونیا کے ساتھ رہنے کا وقت بھی کم ملنے لگا۔ پھر بھی وہ ان کو برابر خط لکھا کرتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے یہ دلچسپ جملہ لکھا ''ہندو روایات کے مطابق غیر شادی شدہ انسان نصف ہی رہتا ہے اور بقیہ نصف اس کی بیوی پورا کرتی ہے۔ تمھارے بغیر میں اپنے کو مشکلات میں گھرا پاتا ہوں''۔ اس مسئلہ پر ان کے عزیز دوست امیتابھ بچن کا تاثر یہ ہے ''مجھے علم ہے کہ راجیو ایک محبت کرنے والے شوہر اور باپ کی حیثیت سے اپنے گھر والوں کو پورا وقت نہیں دے پاتے، مگر ان کے گھر والے بھی ان کی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ ہر معاملے میں اشتراک کرتے ہیں''۔

راجیو کے سیاست میں آنے کے بعد سونیا کے رہن سہن خاص کر لباس کے معاملہ میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ ٹی شرٹ، جینس، لمبے اسکرٹ اور مغربی سوٹ کو چھوڑ کر وہ شلوار سوٹ، چھپی ہوئی سوتی اور ہاتھ کی بنی ہوئی ساریاں، کرتے اور دوسرے ہندستانی روایتی ملبوسات پہننے لگیں۔ اندرا گاندھی نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور انھوں نے سونیا سے پوچھا کہ کیا انھوں نے ایسا کسی کے کہنے سے کیا ہے؟ انھوں نے مسکرا کر اس کی تردید کی۔ پھر بھی اندرا نے ان سے کہا کہ وہ جو لباس جی چاہے پہن سکتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک دوست سے کہا کہ انھیں سونیا کے طور طریقوں پر حیرت ہے کہ انھوں نے کس آسانی سے اپنے آپ کو شوہر کے خاندان، ملک اور سماج سے ہم آہنگ کر لیا۔

اس زمانے میں سونیا نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ انھیں یہ بات اس لئے ضروری محسوس ہوئی کہ اسی زمانے میں راجیو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بن گئے تھے اور ان کی سیاسی مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں۔ وہ اندرا گاندھی کے بہت قریب ہو گئے تھے ان کے ساتھ وی. جارج، وجے دھر اور ارون سنگھ کام کرتے تھے، اور صفدر جنگ روڈ پر ان کے کمروں میں علاقائی لیڈروں، وزیروں، صنعت کاروں، دانش وروں، افسروں اور نوجوان کارکنوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اسی لئے سونیا نے لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا تا کہ ان کے ذریعہ سے لوگ راجیو تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں۔ راجیو گاندھی کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ خطرہ اور زیادہ بڑھ گیا کیونکہ اور بہت سے غیر مخلص اور نا قابل اعتبار افراد ان کے گرد منڈلانے لگے۔

دو بہوؤں کی کہانی

جب سنجے گاندھی کی شادی مینکا گاندھی سے مارچ 1974 میں ہوئی تو اس سے اندرا گاندھی کے گھر میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھی چھوٹا موٹا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تو اندرا گاندھی اور سونیا دونوں ہی نئی اور نوعمر دلہن مینکا سے ہمدردی جتاتیں۔ بڑی بہو ہونے کی وجہ سے سونیا کو گھر میں ایک خصوصی مرتبہ حاصل تھا۔ وہی کھانے پینے کا بندوبست اور باورچی خانہ کا انتظام سنبھالتی تھیں۔ چونکہ مینکا کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے ان باتوں پر کسی جھگڑے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اندرا گاندھی کو ان کی تقریروں کے لئے دلچسپ مقولے اور حوالے مہیا کرتی تھیں۔ ایمرجنسی کے خاتمے اور اندرا گاندھی کے زوال کے بعد انھوں نے ایک رسالہ 'سوریہ' کے نام سے نکالنا شروع کیا جس میں اندرا گاندھی پر جنتا حکومت اور مخالف پارٹیوں کے لگائے ہوئے الزامات کی پُر زور تردید کی جاتی تھی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پُر آشوب دور میں مینکا نے اندرا گاندھی اور خاندان کے وقار کا پُر زور دفاع شاندار طریقہ سے کیا اور ان کے مخالفین کی خوب پول کھولی۔

مگر کبھی کبھی اندرا جی کی قیام گاہ پر زوردار جھگڑے بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔ چنانچہ ایک دفعہ تو مینکا سنجے گاندھی سے اس قدر ناراض ہوگئیں کہ انھوں نے اپنی شادی کی انگوٹھی اتار کر ان کی طرف پھینک دی۔ یہ دیکھ کر اندرا گاندھی بھی مشتعل ہوگئیں کیونکہ یہ انگوٹھی ان کی ماں کملا نہرو کی نشانی تھی۔ سونیا نے جلدی سے وہ انگوٹھی یہ کہہ کر اٹھالی کہ اس کو پریزکا کے لئے رکھ لیں گی چنانچہ آج بھی

پرینکا اس انگوٹھی کو پہنے رہتی ہیں۔ اندرا جی نے سنجے کی شادی کے موقع پر مینکا کو یہ جواہرات سے مرصع انگوٹھی، 21 مختلف قسم کی قیمتی ساریاں، دوسیٹ سونے کے زیورات اور جواہر لعل نہرو کے جیل میں کاتے ہوئے سوت کی کھدر کی ساری بطور تحفوں کے دی تھی۔

ایسا ہی ایک جھگڑا بی. کے. نہرو کی موجودگی میں پیش آیا جب سنجے گاندھی انڈے کے ٹھیک سے نہ تلے جانے پر سونیا پر چلاّ اٹھے تھے۔ اندرا جی نے اس وقت سنجے کو تو کچھ نہیں کہا لیکن وہ ان کے اس ناشائستہ طرز عمل پر بڑی گھبرا گئیں۔ بی کے نہرو صاحب نے اپنی کتاب Nice Guys Finish Second میں اس بارے میں یہ دلچسپ جملہ لکھا ہے ''زیادہ تو نہیں مگر کبھی کبھی 12 ولنگڈن کریسنٹ میں باورچی (سونیا) پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ مینکا تو چپ چاپ کھانے میں لگی رہتی تھی۔ اندرا کے دونوں بیٹوں اور ان کی بیویوں کے درمیان خوشگوار تعلقات یقیناً نہیں پائے جاتے تھے''۔ مشہور صحافی اور مصنف خشونت سنگھ نے بھی راجیو اور سنجے کے باہمی اختلافات کا ذکر کیا ہے۔ ایک تحریر میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''اتفاق سے ایک مرتبہ راجیو اور سونیا کے کسی بچہ کی سالگرہ کے موقع پر میں مسز اندرا گاندھی کے گھر پر موجود تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دونوں بھائی اور ان کی بیویاں ایک دوسرے سے دور اور الگ الگ پھر رہے تھے''۔

ایمرجنسی کے نفاذ کے حق میں نہ تو راجیو تھے اور نہ سونیا۔ مگر انھوں نے اس مسئلہ پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ایک پارٹی میں سونیا کی ملاقات اتفاق سے نوین پٹنائک (اڑیسہ کے نامور سیاست داں اور علاقائی اتکل کانگریس کے صدر بیجو پٹنائک کے صاحبزادے جنھوں نے بعد میں بیجو جنتا دل بنایا تھا) سے ہوئی۔ اس زمانہ میں حزب مخالف کے سب ہی سیاسی لیڈروں کے ساتھ بیجو پٹنائک کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا، سونیا گاندھی نے بلا جھجک اس پر ناخوشی ظاہر کی اور ان سے معافی طلب کی۔

اندرا جی سے قریب رہنے والے لوگوں کی رائے میں دونوں بہوئیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور الگ تھیں کیونکہ ان کا ماحول اور طرز معاشرت ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ سونیا کو یہ

تعلیم ملی تھی کہ اپنے بڑوں کے سامنے ناراضی ظاہر کرنا تو الگ رہا زور سے بولنا بھی ممنوع ہے جب کہ مینکا منہ پھٹ قسم کی تھیں جو بغیر سوچے بولنے کی عادی تھیں۔ اندرا گاندھی اور مینکا کے گھر والوں میں ایمرجنسی کے زمانہ کو چھوڑ کر اچھے تعلقات نہیں رہے۔ ان کی ماں امتیشور آنند کے ایمرجنسی کے دوران اندرا گاندھی سے گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ سنجے اور مینکا کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑے کبھی کبھی سنگین صورت پورے گھر کے لئے پیدا کر دیتے تھے۔ مینکا کی غیر ذمہ داری کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن شادی کے شروع کے برسوں میں سونیا اور مینکا کے درمیان اچھے تعلقات رہے۔ مینکا کو بھی سیاسی معاملات سے دلچسپی تھی مگر اندرا جی کا اعتماد سونیا پر روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ وہ ساریوں کے انتخاب اور تقریباً سارے گھریلو معاملات میں سونیا سے صلاح لیتی تھیں۔

سونیا کے سنجے سے اچھے تعلقات تھے لیکن جب سنجے نے انھیں ماروتی ٹیکنیکل سروسز کا ڈائرکٹر بنایا تو ان میں فرق آ گیا۔ معاہدہ کے بموجب سونیا کو بحیثیت ڈائرکٹر ماہوار تنخواہ کے علاوہ نفع پر 1 فیصد کمیشن، مکان کا کرایہ، سفر کے اخراجات، ڈرائیور کی تنخواہ بھی ملنا چاہیے تھا مگر یہ سہولتیں ان کو نہیں دی گئیں۔ راجیو گاندھی کو جب یہ علم ہوا کہ اس ادارے نے ماروتی لمیٹیڈ سے، جس کی مالی حالت باوجود بینکوں کی فیاضانہ مدد کے سقیم تھی، دس لاکھ روپیہ کی رقم وصول کر لی ہے تو انھوں نے سونیا سے اپنی ناخوشی ظاہر کی اور ان سے کہا کہ ان کو اس معاہدے پر دستخط نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ماروتی کے معاملات پر 1978 میں ایک تحقیقاتی کمیشن نے جس کے صدر ہائی کورٹ کے ایک جج ڈاکٹر اے سی گپتا تھے، جنتا حکومت کو ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا ''یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کمپنی میں ایک غیر ملکی خاتون سونیا گاندھی کو جگہ دی گئی جو فارن ایکسچینج ریگولیشن ایکٹ 1973 کی خلاف ورزی تھی اور ریزرو بینک آف انڈیا سے اس معاملہ کی کوئی اجازت نہیں لی گئی۔ آخر کار 21 جنوری 1975 میں سونیا گاندھی نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا''۔ یہ معاملہ

راجیوگاندھی کے وزیراعظم ہونے کے بعد پھر اٹھایا گیا۔مگر راجیو گاندھی نے اس کی تردید میں یہ وضاحت کی کہ ان کی اہلیہ نے نہ تو کبھی اس کمپنی سے تنخواہ وصول کی اور نہ انھوں نے کبھی ماروتی کے کارخانہ یا دفتر میں قدم رکھا۔

1977 کے الکشن میں ہارنے کے بعد اندرا گاندھی کو اپنی سرکاری قیام گاہ چھوڑ کر اپنے کنبہ و سازوسامان کے ساتھ 12 ولنگڈن کریسنٹ کے ایک چھوٹے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ان کے قدیم باورچی کی الہٰ آباد میں وفات ہوگئی جس کی جگہ کسی نئے آدمی کو رکھنے میں اندرا گاندھی کو اپنی اور اپنے گھر والوں کے تحفظ کے پیش نظر تامل ہوا اور مہینوں تک سونیا کو کھانا پکانا پڑا۔ لوگ انھیں خان مارکیٹ کی دکانوں پر سودا سلف خریدتے دیکھتے تھے۔انھوں نے ولنگڈن کریسنٹ کے عقبی لان میں پالک، بھنڈی، لوکی، دھنیا، مرچ وغیرہ کی کاشت کی، اور جب یہ تازی سبزیاں کھانے کی میز پر لائی گئیں تو نجیے گاندھی نے اندرا کی مثالی بہو کے سلیقہ کی تعریف کی۔

اندرا گاندھی سونیا کی تعریف کرتے نہیں تھکتی تھیں۔اس سے مینکا کے دل کو چوٹ پہنچی، کیونکہ وہ رسالہ 'سوریہ' کے ذریعہ اپنی ساس کا دفاع کر کے ان کی مدد کر رہی تھیں۔انھوں نے سوچا کہ سونیا کی خانہ داری کی اتنی مدح وتوصیف کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے۔مگر اندرا جی کے قریب رہنے والے لوگوں کا خیال تھا کہ سونیا بہت سے معاملات میں مینکا سے بہتر تھیں۔مثلاً محسنہ قدوائی کہتی تھیں ''اندرا جی سونیا کی اس لئے تعریف کرتی ہیں کہ وہ اوسط ہندستانی لڑکی سے اچھی ہندستانی، خانہ داری کے سلیقہ، ملبوسات وتحائف کے انتخاب اور مہمانوں کی خاطر تواضع کے اعتبار سے ان کے معیار پر پورا اترتی ہیں''۔ چنانچہ جب سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں گاندھی صدی کی تقریبات میں ہندوستان آئے تو ان کی دیکھ بھال اندرا جی کے نمائندہ کی حیثیت سے سونیا نے بطریق احسن کی۔1978 میں چک منگلور کے ضمنی پارلیمانی الکشن میں اندرا گاندھی کی زبردست کامیابی نے صورت حال بالکل بدل دی۔اندرا جی اور ان کے کنبہ میں اعتماد کی نئی لہر دوڑ گئی۔اس زمانہ میں سونیا اور مینکا کے تعلقات شگفتہ اور خوشگوار ہوگئے۔فیروز ورن کی ولادت

کے زمانہ میں بڑی بہو نے مینکا کی تمام ضرورتوں کا پورا خیال رکھا اور اپنا زیادہ وقت انھیں کے پاس صرف کیا۔ مینکا کو ولنگڈن کریسنٹ اس لئے زیادہ پسند تھا کہ وہاں انھیں سنجے گاندھی کو ٹھیک سے سمجھنے کا موقعہ ملا۔ وہ سمجھ گئیں کہ انھیں ایمرجنسی کی زیادتیوں کی وجہ سے بدنام کیا گیا اور اس میں بعض کانگریسی بھی شامل تھے۔ انھوں نے ان کی مدافعت میں کئی انٹرویو دیے اور ان کے خلاف غلط الزامات کی تردید کی۔

2001 میں جب مینکا اٹل بہاری کی مرکزی حکومت میں وزیر تھیں، انھوں نے 12 ولنگڈن کریسنٹ کو اپنی قیام گاہ بنانے کی کوشش کی مگر وزیر متعلقہ مسٹر جگموہن نے یہ مکان ان کی جگہ تامل ناڈو کی پی ایم کے پارٹی ممبر مسٹر پنوسوامی کو دے دیا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ قضیہ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ سنجے گاندھی کی یاد میں سنجے گاندھی میموریل ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کا دفتر 12 ولنگڈن کریسنٹ میں تھا۔ اٹل بہاری کی حکومت نے یہ عمارت ٹرسٹ سے زبردستی خالی کروالی اور مینکا گاندھی خاموش رہیں کیونکہ ان کو اس میموریل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ان کے خیال میں اس کے ذریعہ کچھ کانگریسی سیاست دان فائدہ اٹھا رہے تھے۔ بہرحال اس سلسلے میں مینکا اپنی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتیں۔ یہ ٹرسٹ 24/ اکبر روڈ کے ایک چھوٹے کمرہ میں منتقل کردیا گیا۔

سنجے گاندھی کے انتقال کے وقت راجیو اور سونیا اٹلی میں تھے انھیں لانے کے لئے ایک خصوصی طیارہ اٹلی بھیجا گیا جو وہاں سے لندن مینکا کی ماں امتیشور، بہن امبیکا اور کانگریسی لیڈر وی سی شکلا کو لیتا ہوا واپس دہلی آیا۔ راستہ میں وی سی شکلا نے مینکا کی ماں کو تلقین کی کہ وہ اندرا جی کے گھرانے کے اتحاد کو قائم رکھنے اور راجیو کی مدد کے لئے کام کریں، مگر شاید شدت غم کی وجہ سے انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ادھر کچھ کانگریسی لیڈروں نے جنھیں سنجے گاندھی سے شکایتیں تھیں یہ مہم شروع کردی کہ آنند گھرانہ اندرا گاندھی پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ مینکا کو سیاست میں لائیں۔ ان باتوں کا بھی خاصا اثر ملکی سطح پر محسوس کیا گیا۔ بہرحال سنجے کی موت کے بعد حالات خاصے بدل گئے۔ اندرا جی بہت شکستہ اور مغموم ہوگئیں۔ سنجے کے حادثۂ وفات کا ذمہ دار کبھی اپنے

آپ کو ٹھہراتیں اور کبھی مینکا پر الزام لگاتیں۔ انھوں نے راجیو سے ہوابازی چھوڑ دینے کے لئے بار بار اصرار کیا کیونکہ وہ ان کے بارے میں خوفزدہ تھیں۔ راجیو نے اپنی غمزدہ ماں کے پاس زیادہ وقت صرف کرنا شروع کیا اور سیاسی حلقوں میں خبریں گشت کرنے لگیں کہ راجیو سنجے کی جگہ سنبھالنے والے ہیں۔ ان باتوں سے مینکا کو سخت صدمہ ہوا۔ ان سے اندرا گاندھی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کو اپنا ذاتی سکریٹری بنالیں گی۔ انھیں حیرت تھی کہ راجیو جیسے نوآموز کو اندرا جی کیوں اور کس طرح سیاست میں لانا چاہتی ہیں۔ سنجے کی جانشینی کے معاملہ میں اندرا کے قریبی حلقوں میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ مینکا کے گھر والے ان کو سیاست میں بلند درجہ پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اندرا جی تذبذب کے عالم میں کوئی فیصلہ نہیں کر پارہی تھیں۔ اس موقع پر سونیا نے مینکا کے سیاست میں آنے کی مخالفت کی، گو وہ راجیو کو بھی خارزار سیاست سے الگ رکھنا چاہتی تھیں مگر انھیں مینکا کے سیاسی شعور اور منصوبوں پر شبہہ تھا اور وہ انھیں ناقابل اعتبار سمجھتی تھیں۔ پوپل جیکر کا کہنا ہے کہ شروع میں اندرا کو اپنی نوجوان بیوہ بہو سے ہمدردی تھی اور وہ ان کو اپنا سکریٹری بنانا چاہتی تھیں مگر یہ چیز سونیا کو پسند نہیں آئی۔ اس معاملہ پر ساس بہو میں خط و کتابت بھی ہوئی اور آخر میں راجیو کی خاطر اندرا جی نے اپنا یہ منصوبہ منسوخ کردیا۔ اس طرح سونیا نے مینکا کو سیاست میں نہیں گھسنے دیا مگر اسی کے ساتھ وہ راجیو کو بھی سنجے کی جگہ پر دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ بلکہ ایک موقع ایسا آیا کہ انھوں نے زخمی شیرنی کی طرح راجیو کو یہ دھمکی دے دی کہ اگر وہ سیاست میں گئے تو وہ اپنے بچوں سمیت اپنی انسانی آزادی اور تحفظ کے لئے ان کو چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد سونیا نے اپنا مزاحمتی رویہ بدل دیا۔ انھیں راجیو اور اندرا کے تعلقات کا خیال آیا اور خاص طور پر راجیو کی فرض شناسی کا۔ چنانچہ اس بارے میں انھوں نے لکھا ہے ''اس وقت میں ملکی نظام سے ناخوش اور غیر مطمئن تھی اور مجھے خطرہ تھا کہ راجیو کو قربانی کا بکرا بنایا جارہا ہے جس سے وہ پورے طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ مگر راجیو نے اپنی ماں کی تقلید کی جب انھوں نے وزیراعظم نہرو کے گھر کو سنبھالنے کی ذمہ داری اپنا فرض سمجھ کر نبھائی۔ مجھے احساس ہوا کہ اس خلا کو راجیو کے سوا کوئی پُر نہیں

کرسکتا۔ اوراس لئے مجھے اس صورت حال پر رضا مند ہونا پڑا''۔

گو سونیا نے مینکا کے سیاست میں آنے کی مخالفت کی وضاحت پیش نہیں کی۔ مگر ان کے نزدیکی حلقوں کا خیال ہے کہ انھیں مینکا کی نا تجربہ کاری اور مغرور مزاجی سے اندرا گاندھی کونقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اوراسی کے ساتھ ہی انھیں مینکا کے خاندان والوں کی نیت پر بھی شبہہ تھا۔

اندرا جی کے گھر سے مینکا کو بہت سے روایتی ساس بہو کے جھگڑوں کے بعد نکلنا پڑا جس پر ایک دلچسپ ٹی وی سیریل بنایا جاسکتا ہے۔ اس موقع پر اندرا جی کی مثالی بہو کھانا پکانے، سامان و ملبوسات کی خریداری اور بچوں کی پرورش میں دلجمعی سے لگی رہیں۔ انھوں نے نہ تو کسی سیاسی مسئلہ میں دلچسپی لی اور نہ مینکا سے صلح صفائی کرانے کی کوئی کوشش کی۔ ان کے کچھ دوستوں کے خیال میں سونیا نے انسانی جذبات کے مطابق مینکا کی طرف سے پیش آنے والے خطرات اور اپنے تحفظ کے لئے صحیح راستہ اختیار کیا۔

مگر مینکا کو اس معاملہ میں سونیا سے کوئی شکایت نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سنجے کے مرتے وقت ہی اندرا گاندھی اور ان کے کنبہ کے دوسرے افراد نے ان کے ساتھ اپنا رویہ بدل دیا تھا اور انھیں صرف مینکا کی حیثیت سے یاد رکھا۔ پھر انھوں نے سنجے گاندھی کے کچھ دوستوں کے تعاون سے سیاست میں آزاد فرد کی طرح حصہ لینا شروع کیا۔ مگر جب انھوں نے اندرا کے خلاف آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھیں پتہ چلا کہ ڈمپی اکبر احمد کو چھوڑ کر سنجے گاندھی کے سب ہی ساتھی ان سے الگ ہو چکے ہیں۔ ڈمپی نے سنجے منچ کے ذریعہ سنجے اور مینکا کا ساتھ بہت دن تک دیا۔ ادھر اندرا جی نے مینکا سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ کوئی سیاسی ادارہ چلانا چاہتی ہیں تو انھیں صفدر جنگ روڈ چھوڑنا پڑے گا۔

پھر بھی مینکا نے اندرا جی کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ ایک شاطر کی طرح اس وقت کیا جب اندرا گاندھی سونیا کے ساتھ لندن میں تھیں اور راجیو مختلف سیاست دانوں، دانشوروں اور افسروں

سے سیاسی رموز سیکھنے میں مصروف تھے۔ 28/ مارچ 1982 کو اندرا گاندھی لندن سے واپس آئیں، وہ اتنی ناراض تھیں کہ انھوں نے مینکا کے سلام کا جواب تک نہ دیا اور ننگے پیر مینکا کے کمرے میں داخل ہوکر آر کے دھون اور دھیریندر برہمچاری کی موجودگی میں مینکا کو اپنی قیام گاہ سے نکل جانے کا حکم سنا دیا، جسے سن کر پہلے تو مینکا نے اپنی معصومیت کا اظہار کیا اور اپنے نکالے جانے کی وجہ ان سے پوچھی۔ جب اندرا گاندھی نے سنجے وچار منچ میں کی گئی ان کی تقریر کا حوالہ دیا تو انھوں نے اس کا اقرار کرلیا، یہ سن کر اندرا جی اور مشتعل ہوگئیں اور گرما گرمی کے بعد انھوں نے مینکا کو حکم دیا کہ وہ فوراً خالی ہاتھ ان کے مکان سے نکل جائیں۔ یہ جھگڑا دیر تک چلتا رہا اور ا بجے رات کو مینکا جی صفدر جنگ روڈ سے نکلیں۔ اس تاریخی واقعہ کو غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں، رائٹر، بی بی سی اور میڈیا نے خوب مشتہر کیا۔ ایک فوٹو گرافر نے سارے واقعہ کی تصویریں کھینچ لیں۔ اس نے کہا کہ ''اندرا جی بال بکھرائے غصہ میں چیخ رہی تھیں اور مینکا آنکھوں میں آنسو بھرے گلوگیر آواز میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے سینکڑوں فلمی مناظر دیکھے مگر ایسا قدرتی اور دلچسپ منظر میں نے پہلی بار دیکھا''۔

اس واقعہ کے بعد اندرا کی دونوں بہوؤں میں کھل کر ٹھن گئی۔ سونیا نے تو اس معاملہ میں زیادہ تر اپنی زبان بند رکھی مگر مینکا نے بلا کسی لحاظ کے اپنی جٹھانی پر طرح طرح کے ذاتی حملے کیے اور باتیں سنائیں۔ دور درشن پر ایک تقریر میں انھوں نے کہا ''یہ واقعہ ہے کہ وہ ایک بدیسی عورت ہیں۔ انھوں نے نہ تو کوئی سماجی کام کیا ہے اور نہ اس کی ٹریننگ حاصل کی۔ سیاست ماں کے پیٹ سے کوئی سیکھ کر نہیں آتا۔ ہم سب پڑھ لکھ کر اور سیکھ کر بہت کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اس کی ضرورت محسوس کریں''۔

اس جھگڑے کی نوعیت اس وقت اور بدل گئی جب 1999 میں اٹل بہاری واجپئی نے اپنی نیشنل ڈیموکریٹک الائنس سرکار میں مینکا کو اپنی کابینہ کا وزیر مقرر کیا۔ مینکا آزاد ممبر پارلیمنٹ یو۔ پی.

پیلی بھیت ضلع سے منتخب ہوگئیں تھیں۔ ان کو کلچر کا محکمہ دیا گیا۔ اس طرح ان کو سونیا کے زیر اہتمام چلنے والے مختلف ٹرسٹوں کی جانچ کرنے اور ان کے معاملات میں دخل اندازی کا اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ مینکا نے کچھ ٹرسٹوں میں ہونے والی مالی بدعنوانیوں کی تحقیقات کا حکم دیا اور خاص طور پر اپنا نشانہ اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس کو بنایا۔ ان معاملات میں ان کے فوری اقدامات نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفعتاً مینکا سے کلچر کا محکمہ لے لیا گیا اور ان کو وزارت اعداد و شمار کا محکمہ دے دیا گیا۔ مینکا نے اس کابینی تبدیلی کا ذمہ دار سونیا کو ٹھہرایا۔

کیتھرین فرینک کی کتاب ''لائف آف اندرا نہرو گاندھی'' میں اس جھگڑے کی مزید تفصیلات شائع ہوئیں۔ جن کے بارے میں مینکا نے کھل کر بڑی بہو پر الزام لگایا کہ ان کے کہنے پر اس کتاب میں سنجے کے بارے میں جھوٹی باتیں شامل کردی گئیں۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ سونیا اور کانگریس کے ذمہ دار سنجے کی تصویر اور کردار کو مسخ کر کے سونیا، پرینکا اور راہل کو نہرو- گاندھی خاندان کا اصلی وارث ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ فرینک کتاب لکھنے کے دوران سونیا گاندھی سے ملے تھے اور ان کے توسط سے کچھ تاریخی خطوط اور تصویروں کو دیکھنے کا موقعہ بھی انھیں ملا جس کا انھوں نے اپنی کتاب میں شکریہ ادا کیا ہے۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی تو کچھ کانگریسی لیڈروں نے محسوس کیا کہ کتاب میں کچھ جگہوں پر اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی کے منفی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بنا پر پارٹی کے لٹریری مشیر کنور نٹور سنگھ اور کانگریس کے ترجمان جے پال ریڈی نے سونیا گاندھی کو مشورہ دیا کہ وہ ان بیانات کے خلاف نہ تو کوئی بیان جاری کریں اور نہ کتاب کے ضبط کرنے کا مطالبہ کریں۔ مگر مینکا نے جھٹ پٹ انگلینڈ میں ہتک عزت کا مقدمہ دائر کیا اور مصنف سے عدالت کے باہر مفاہمت کرلی۔ انھوں نے بتایا کہ اس مقدمہ کو دائر کرنے کی صلاح ان کے بیٹے ورون نے دی تھی۔ مینکا کو نہرو- گاندھی گھرانے کی وراثت میں حصہ نہ ملنے کا کچھ زیادہ افسوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

کانگریس کو نہرو-گاندھی ورثہ قرار دینا صحیح نہیں۔ وراثت کنبہ کے مقرر کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ انھیں سونیا گاندھی کی ان خوشیوں پر کوئی اعتراض نہیں جن سے وہ اپنی سیاسی اہمیت بڑھانا چاہتی ہیں۔ راہل اور ورون نے ایک دوسرے کے خلاف ذاتی حملے کرنے سے پرہیز کیا۔ البتہ نٹور سنگھ اور سونیا کیمپ کے کچھ افراد نے مینکا کی بی جے پی کی ملی جلی سرکار میں شمولیت کو اندرا گاندھی کے مخالفین کے ساتھ مل جانے سے تعبیر کیا اور ان کے سیاسی کردار پر نکتہ چینی کی۔

وزیراعظم کی اہلیہ

اکتوبر 1984 کی آخری صبح کو اندرا گاندھی نے اپنے پوتے اور پوتی کو اسکول جانے سے پہلے پیار کر کے رخصت کیا۔ پرینکا نے محسوس کیا کہ اور دنوں کے مقابلہ میں اس دن ان کی دادی ان کو معمول سے زیادہ دیر تک لپٹائے رہیں اور پھر اندرا جی نے سرگوشی کے لہجے میں راہل کے کان میں کہا کہ اگر ان کو کچھ ہو جائے تو وہ زیادہ رنج وغم نہ محسوس کریں۔

جون 1984 سے جب ہندستانی فوج نے علاحدگی پسندوں کو نکالنے کے لئے گولڈن ٹیمپل امرتسر پر چڑھائی کی تھی اسی دن سے اندرا جی کو یقین ہو گیا تھا کہ کسی روز وہ تشددانہ جارحیت کا نشانہ بن جائیں گی۔ اسی لئے وہ چودہ سالہ راہل سے اپنی آخری رسومات اور زندگی کے خاتمہ کے بارے میں بات چیت کرتی رہتی تھیں۔ کیونکہ ان کو اپنے پیارے چھوٹے ساتھی سے تبادلۂ خیال کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس قسم کی بات چیت کو راہل گاندھی نے اپنے والد راجیو گاندھی کے سامنے دہرایا جسے سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور پھر راہل نے یہ کہا کہ دادی نے ایسا واقعہ ہونے پر زیادہ رونے دھونے سے ان کو منع کیا ہے۔

31/اکتوبر 1984 کی صبح کو اندرا گاندھی کو پیٹر اسٹینیو کو انٹرویو دینا تھا۔ چنانچہ وہ نو بج کر 12 منٹ پر چمک دار زعفرانی ساڑی میں ملبوس اپنی رہائش گاہ صفدر جنگ روڈ سے متصل اکبر روڈ پر اپنے دفتر جانے کے لئے نکلیں تو لکڑی کے چھوٹے دروازے پر متعین ایک سکھ پہریدار نے ان کو سلام کیا جس کا جواب انھوں نے مسکراہٹ سے دیا۔ اسی وقت ان کی نظر اس بندوق پر پڑی جوان

کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ جب تک ان کا چھاتہ بردار ملازم نرائن سنگھ چھتری پھینک کر مدد کے لئے چلاتا اور انڈو تبتی بارڈر فورس کے جوان موقعہ پر پہنچتے بے انت سنگھ اور ستونت سنگھ اندرا جی کے جسم میں 36 گولیاں پیوست کر چکے تھے۔ اندرا جی کو کئی مرتبہ مشورہ دیا جاچکا تھا کہ وہ ہر وقت سیفٹی بیلٹ پہنے رہا کریں اور اپنے حفاظتی عملہ میں کسی سکھ کو نہ رکھیں مگر انھوں نے اس پر کبھی عمل نہیں کیا۔ وہ کہتی تھیں کہ گھر پر اتنی بھاری جیکٹ پہننے کی کیا ضرورت ہے اور اپنے پہرے داروں میں کسی کو ہٹانے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئیں۔ اس واقعہ سے چند ہفتے قبل اندرا جی نے فخریہ بے انت سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ''جب ایسے سکھ میرے پاس ہوں تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں''۔ ان کو یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں ان کے گھر والوں کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

پی سی الیگزینڈر جو عرصہ تک ان کے سکریٹری رہے تھے کہتے ہیں ''جون 1984 سے ان کے دل میں ایک خوفناک اندیشہ پیدا ہوگیا کہ ان کے بچوں کو اغوا کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ میرے لاکھ کہنے اور سمجھانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا''۔

جس وقت یہ واقعہ پیش آیا سونیا غسل کے دوران اپنے بال دھو چکی تھیں۔ گولیوں کی آواز کو پہلے انھوں نے دیوالی کے پٹاخوں کی آواز سمجھا مگر آواز کی شدت نے ان کو ہیجان میں ڈال دیا اور وہ ممی ممی چیختے ہوئے نہانے کے گاؤن میں دوڑ پڑیں۔ انھوں نے جلدی سے اندرا گاندھی کے سر کو اپنی گود میں لے لیا اور اسی حالت میں سفید ایمبیسڈر کار میں بیٹھ کر 3 کلومیٹر دور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز پہنچ گئیں۔ غالباً اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اندرا جی دم توڑ چکی تھیں پھر بھی ڈاکٹروں نے کئی گھنٹے تک خون کی بوتلیں چڑھا کر اور دوسری تدبیریں کر کے ان کی زندگی بچانے کے لئے جان لڑادی۔ مگر وہ قسمت سے نہ جیت پائے۔ اس وقت راجیو بنگال کے انتخابی دورہ پر گئے ہوئے تھے، حادثہ کی خبر مرکزی خفیہ ایجنسی سے ملتے ہی وہ ایک جیپ کے ذریعہ کلکتہ پہنچے۔ مگر بنگال کے وزیر اعلیٰ جیوتی باسو اور کانگریسی رہنما سدھارتھ شنکر رے نے ان کو یہی بتایا کہ وہ نازک حالت میں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں زیر آپریشن ہیں۔ وہ ہوائی جہاز سے دہلی

پہنچے اور سیدھے انسٹی ٹیوٹ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی سونیا گاندھی پھوٹ کر رونے لگیں اور خود راجیو بھی کچھ دیر کے لئے رنج وغم کی زیادتی سے سکتہ میں پڑ گئے۔ پی سی الیگزینڈر نے ان کو تسلی دی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ذرا ہی دیر بعد راجیو اپنے ہوش میں واپس آ گئے اور سونیا گاندھی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آنکھ میں آنسو بھرے ہوئی سونیا نے ان سے درخواست کی کہ وہ کسی قیمت پر وزیراعظم بننا نہ منظور کریں۔ مگر راجیو گاندھی نے ان کی پیشانی کو بوسہ دے کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ وہ اس فریضہ کو ہر حال میں انجام دیں گے''۔

صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ صنعا (یمن) کے دورہ پر تھے۔ ان کو اندرا جی کے قتل کی اطلاع دی گئی اور ان سے فوراً واپس آنے کی درخواست کی گئی۔ ذیل سنگھ نے دہلی پہنچتے ہی اس فیصلہ کا اعلان کیا کہ وہ اندرا گاندھی کی خواہش کے مطابق راجیو گاندھی کو ہندوستان کا وزیراعظم بنا رہے ہیں۔ حالانکہ ادھر چند برسوں سے ان کے اور راجیو کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ گو اس مسئلہ پر ان کی اندرا جی سے کبھی بات نہیں ہوئی تھی مگر انھیں ان کی خواہش کا پورا علم تھا۔ اس وقت انھوں نے راجیو کی صاف ستھری شخصیت اور ذہانت کا بھی اعتراف کیا۔ مگر اپنے عہدہ چھوڑنے کے بعد ان کی رائے اس معاملہ میں بدل گئی تھی۔

جب آر کے دھون اور پی سی الیگزینڈر نے یہ خبر راجیو گاندھی کو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں سنائی تو وہ اس سے کچھ بھی خوش نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ''میں نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا اور مجھے سونیا سے مشورہ کرنا ہوگا''۔ چنانچہ اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انھوں نے اس پیش کش کو منظور کر لیا۔

اندرا جی کے انتقال کے بعد کئی مہینے تک سونیا سب سے الگ تھلگ اپنی دنیا میں محور ہیں۔ دو ماہ میں ان کا وزن پندرہ پونڈ کم ہو گیا اور ان پر دمہ کے دورے جلد جلد پڑنے لگے۔ انھوں نے مغربی لباس پہننا پہلے ہی چھوڑ دیا تھا اور 1983 میں انھوں نے اطالوی شہریت بھی چھوڑ دی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ راجیو کے ساتھ دوروں پر جانے لگیں اور ان کے پارلیمانی حلقہ امیٹھی کی

طرف توجہ کرنے لگیں۔اس معاملہ میں ستیش شرما سے انھیں بڑی مدد ملی۔

راجیو ہر معاملہ میں سونیا سے مشورہ کرتے تھے۔اس کے علاوہ وہ رات کو ان سے ہندوستان کی تاریخ، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور ہندوستان کی سماجی حالت پر کھل کر بات چیت کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے سونیا گاندھی ان کی سیاسی حکمت عملیوں اور ملک کے انتظامی معاملات میں ان کی مدد کرنے لگیں۔

اس وقت بحیثیت وزیراعظم کی اہلیہ کے وہ تصویروں میں سب سے الگ تھلگ، خاموش اور بے تعلق خاتون نظر آتی ہیں۔راجیو گاندھی کے کچھ مخالفین کا کہنا تھا کہ وہ نور جہاں کی طرح پردے کے پیچھے سے حکومت کر رہی تھیں اور کچھ لوگوں کی خیال میں وہ یونان کی فرضی ظالم دیوی اسفنکس کے نقش قدم پر چل رہی تھیں جو اپنے سوالات کا جواب نہ دینے والے مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی تھی۔

1984-89 یعنی راجیو گاندھی کی وزارت کے دور میں سونیا سیاست سے الگ رہ کر معمول کے مطابق گھریلو زندگی گزارتی رہیں۔ان کے کچھ ہندستانی اور یورپین دوستوں کا ایک چھوٹا سا گروپ تھا جو اتوار کی دوپہر کو کھانا کھانے اور گپ شپ لڑانے کے لئے ریس کورس پر جمع ہو جاتا تھا۔یہاں فرنچ، اطالوی اور اسپینی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ان ہی میں سے ایک فرد اتاویو قطروچی بھی تھے۔اسی زمانے میں سونیا کی بہن ناڈیا کے شوہر جوش والڈی مورو بھی نئی دہلی میں اسپین کی طرف سے سفارتی خدمات انجام دے رہے تھے۔تھالیوں میں طرح طرح کے ہندستانی اور اطالوی کھانے مہمانوں کو پیش کئے جاتے تھے۔اکثر سونیا اپنی پکانے کی مہارت کا ثبوت لاسکنا اور لہسن کی چٹنی کے ساتھ جھینگوں کی شکل میں دیتی رہتی تھیں۔جب راجیو گاندھی وزیراعظم بنے تو ان کا دفتر 7 ریس کورس روڈ میں تھا اور قیام گاہ 5 ریس کورس روڈ پر۔گھر پر وجاہت حبیب اللہ اور منی شنکر ایّر جو دون اسکول میں راجیو کے ساتھ پڑھ چکے تھے اور سام پترودا اور پی چدمبرم جیسے بے تکلف دوستوں تک کو آنے کی اجازت نہ تھی۔البتہ سمن سنجولیکا دوبے، جیا بچن اور امیتابھ بچن،

ارون نینا سنگھ، موہن، نرمل تھڈانی، مائیکل اوشا البوقرق، سنیتا، اتاویو اور میریا قطروچی، ستیش شرما اور کچھ ذاتی دوست گھر پر آیا کرتے تھے۔ دوبے اور ان کی بیوی نجولیکا سے سونیا کو اپنی کتاب ''راجیو'' لکھنے میں بڑی مدد ملی۔

سونیا صبح 6 بجے اٹھ جاتی تھیں اور گھر والے ناشتہ مل کر 8:30 بجے کر لیتے تھے۔ اخباروں پر سرسری نظر ڈالنے اور گھر کا انتظام کرنے کے بعد دوپہر کو کچھ دیر کے لئے وہ بازار یا نمائش دیکھنے نکل جاتیں۔ راجیو کی غیر حاضری میں وہ شام کو ویڈیو پر فلمیں دیکھا کرتی تھیں۔

سونیا کے پاس اندرا جی کی تحفوں میں ملی ہوئی بہت سی ساریاں تھیں۔ جب وہ کانگریس کی صدر ہوئیں تو انھوں نے کانگریس کمیٹی کے کارکنوں کو یہ ساریاں بانٹنا شروع کیں۔ یہ بھی مشہور کیا گیا کہ ان کے پاس بڑی تعداد میں ساریاں، سینڈلیں، شاہ توش اور جامہ دار کی شالیں اور آرٹ کے نوادرات جمع ہیں۔ ان کی ساریوں کی تقسیم پر شرد پوار نے ساری ڈپلومیسی کی پھبتی کسی، اور مئی 1999 میں سونیا کے خلاف علم بغاوت اٹھانے سے قبل انھوں نے الزام لگایا کہ ارجن سنگھ کی بیوی اکارانی سروج صاحبہ سونیا کے لئے چندیری ساریاں جمع کرتی ہیں۔

16 ؍اپریل 1987 تک راجیو اور سونیا کی زندگی سکون سے گزری۔ مگر اُس دن سویڈن ریڈیو سے یہ ناقابل یقین خبر نشر کی گئی کہ بوفورس بندوقوں کی خریداری کے لئے سویڈن کی اسلحہ کمپنی نے ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں کو چھ سو ملین ڈالر کی رشوت دی ہے اور بہت بڑے آرڈر کے ملنے کی خوشی میں مارٹن ارڈبو، بوفورس کمپنی کے جوشیلے مینیجنگ ڈائرکٹر نے اپنی کمپنی کی عمارت پر ہندستانی پرچم نصب کر دیا۔

مشہور صحافی ویر سنگھوی نے اس واقعہ کو راجیو گاندھی کی سیاسی ناتجربہ کاری سے تعبیر کیا اور کہا کہ اگر ان کی جگہ کوئی منجھا ہوا وزیر اعظم ہوتا تو اس معاملہ کی تحقیقات کا فوری اعلان کر کے اپنا پیچھا چھڑا لیتا۔ مگر راجیو نے سرے سے کمیشن یا رشوت دیے جانے کی تردید کی اور یہ کہا کہ اس سودے میں کسی ایجنٹ کا دخل ہی نہ تھا، مگر ان کا دعویٰ غلط نکلا۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ کمپنی نے کمیشن کی ادائیگی

بہر حال کی تھی خواہ اس سے کسی ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ ویر سنگھوی نے اس معاملہ کی خوب چھان بین کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی۔

مخالفوں نے اس قضیے میں راجیو اور ان کے گھر والوں کو گھسیٹ لیا جس سے انھیں سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بوفورس بندوقوں کا انتخاب فوج کے سربراہ جنرل کے سندر جی نے کیا تھا۔ اس معاملہ میں راجیو پر کسی قسم کی مالی بدعنوانی کی شہادت تو نہیں مل سکی مگر ان کی بدنامی خاصی ہوئی اور آگے چل کر یہی ان کے زوال کا سبب بنی۔

اس قضیہ نامرضیہ میں راجیو کے مخالفوں کا پلہ اس وجہ سے اور بھاری ہو گیا کہ بوفورس اسلحہ کی خریداری کے ایک ایجنٹ سونیا کے اطالوی نژاد دوست قطروچی تھے جو وزیر اعظم کے گھر پر اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس اطلاع کے ملنے کے بعد قطروچی اور سونیا کے یورپین دوستوں کا اتوار کا جمگھٹا اور تھالیوں کے لنچ کا معمول ختم ہو گیا۔

سونیا کا نام آنے کے بعد اس مسئلہ نے اور سنگین صورت اختیار کر لی۔ راجیو حکومت کے تمام کاروباری معاملات کی جانچ کی گئی اور جب وزیر اعظم نے وزیر دفاع ارون سنگھ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا تو طرح طرح کی افواہوں کا بازار گرم ہو گیا۔ دون اسکول کے ہم جماعتوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ ارون سنگھ چاہتے تھے کہ بوفورس کا سودا سرے سے کالعدم قرار دے دیا جائے مگر راجیو گاندھی اس کے شدید مخالف تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ہندوستان کی ساکھ اسلحہ جات کے بین الاقوامی بازار میں گر جائے گی۔

ارون سنگھ نے راجیو سے اختلاف کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ وہ چپ چاپ دہلی چھوڑ کر اترانچل کے ایک دور افتادہ فارم ہاؤس میں خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ کئی برس بعد 2001 میں انھوں نے واپس آ کر وزارت دفاع میں ایک غیر اہم عہدہ قبول کر لیا۔

ادھر سونیا سے ارون سنگھ کی بیوی نینا سے کافی چھن رہی تھی۔ 1980 سے وہ سونیا کے ساتھ امیٹھی کے پارلیمنٹری حلقہ میں جا کر دوائیں بانٹتی اور رفاہی کاموں میں حصہ لے رہی تھیں۔ گاؤں

گاؤں گھوم کر وہ عورتوں کی فلاح بہبود، خاندانی منصوبہ بندی کے لئے کام کرتیں۔ سونیا گاندھی تقریر کے بجائے کبھی کبھی یہ فقرہ بول اٹھتیں ''پتی جی کو ووٹ دیجئے''۔ ان کے اس جملہ اور سونیا کی مسکراہٹ سے مقامی لوگوں کو بڑا لطف آتا تھا اور سونیا اس علاقہ میں بڑی ہر دلعزیز ہوگئی تھیں۔

راجیو گاندھی نے سونیا کی بدنامی کا اندازہ کر کے اس کے ازالہ کی کوشش کی۔ ملک میں لال بہادر شاستری کو چھوڑ کر جتنے بھی لوگ وزیراعظم بنے یا تو وہ رنڈوے یا کنوارے مرد تھے یا بیوہ خاتون، اس لئے ہندستانی عوام اور میڈیا کینیڈی اور بلیر جیسے خوش وخرم جوڑوں کی حکمرانی کی تزک بھڑک سے واقف نہیں تھے۔ جب انھوں نے راجیو کو سونیا کا دفاع کرتے دیکھا تو اس کو بیوی سے مرعوبیت یا دباؤ کا نتیجہ سمجھا، یہاں تک کہ جو کانگریسی لیڈر راجیو سے بدظن تھے انھوں نے بھی سونیا پر حملوں سے لطف اٹھایا۔ راجیو اور سونیا کے معیار زندگی، لباس و فیشن کی تراش خراش، اچھے جوتوں، آرام دہ کاروں اور سامان آسائش کے شوق پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔ اور عوامی جلسوں میں اس پر کھلم کھلا تنقید کی گئی۔ نئی دہلی میں لوگوں نے اعتراض اور شک وشبہہ کے ساتھ اپنے وزیراعظم کو جارڈن کے شاہ حسین کی تحفہ میں دی ہوئی شاندار مرسڈیز بینز کار چلاتے دیکھا۔ بقول منی شنکر ایّر جو فارن سروس کے ایک ذمہ دار افسر اور سیاست داں تھے میڈیا کے لوگوں کو ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہونے والے فرد کا دولت اور آسائش سے مملو زندگی گزارنا پسند نہیں آیا۔

راجیو گاندھی کی سالانہ پُر تکلف چھٹیوں، ان کی مصوری اور جنگلاتی زندگی کے شوق پر بھی اعتراض کئے گئے۔ سیاست میں آنے سے قبل راجیو اور سونیا اٹلی اور ہندوستان میں باقاعدگی سے چھٹیاں منایا کرتے تھے۔ کرسمس اور نئے سال کے موقعہ پر تمام کنبہ اکٹھا ہوا کرتا جن میں سونیا کی ماں، ان کی بہنیں اور ان کے شوہر بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ راجیو گاندھی کے وزیراعظم بننے کے بعد بھی جاری رہا۔ سونیا کی والدہ اور بہنیں راجیو، سونیا، پریانکا اور راہل کے ساتھ 1985 میں مدھیہ پردیش کے کانہا نیشنل پارک بھی گئے۔ اگلے سال رنتھمبور کی باری آئی جہاں اس وقت کی مشہور ترین اداکارہ سری دیوی نے مخصوص حاضرین کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ میڈیا نے

اس کا خوب تذکرہ کیا۔ ایک غریب ملک میں اعلیٰ حکمراں سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ تفریح کرتا پھرے۔ راجیو پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ مخلصوں کی صلاح کے خلاف اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جیتے رہے۔ دسمبر 1987 میں وہ گھومنے پھرنے لکش دیپ جا پہنچے۔ اس عرصہ میں بوفورس کا معاملہ زور پکڑتا رہا۔ جب راجیو نے پانی سر سے اونچا ہوتا دیکھا اور اس کے تدارک کی فکر کی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

1989 کے الکشن میں راجیو کی شکست ایک لحاظ سے سونیا اور ان کے بچوں کے لئے اچھی ثابت ہوئی کیونکہ اب حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے راجیو ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے۔ بقول سونیا ''...اب ہمیں روزمرہ زندگی میں مسرت اور اطمینان ملنے لگا۔ ہم ہنسی خوشی مل بیٹھ کر کھانا کھاتے، ویڈیو فلمیں دیکھتے اور موسیقی سنتے''۔ یہی حال راجیو کا بھی تھا، وہ شکست سے بہت زیادہ دل شکستہ نہیں ہوئے اور بیوی بچوں کے ساتھ گھریلو زندگی کا آرام اٹھانے لگے۔ مگر جلد ہی راجیو پھر سیاست میں سرگرم ہو گئے۔ گجرات کے کانگریسی لیڈر احمد پٹیل بیان کرتے ہیں کہ ''راجیو گاندھی نے عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھری گرمی میں ریل سے یوپی کا دورہ کیا اور بڑے بڑے عوامی اجتماع کے سامنے تقریریں کیں''۔ اس زمانے میں سونیا گاندھی نے ان کا پورا ساتھ دیا۔ وہ ان کی باتیں غور سے سن کر ان کو صلاح مشورے دیتی تھیں۔

1991 کے عام انتخابات کا سامنا کرنے کے لئے راجیو نے ان کانگریسی ممبروں کی فہرست بنائی جنھیں مالی مدد کی ضرورت تھی اور ان کی موت کے بعد ان کی بیوہ نے یہ کام بخوبی انجام دیا، جس سے سب لوگ بڑے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ایک سابق کانگریسی ترجمان چندو لال چندراکر نے نرسمہا راؤ کے دور حکومت میں کہا ''میں کبھی اس خاندان کو چھوڑ نہیں سکتا، مجھے الکشن میں روپیوں کی سخت ضرورت تھی، عین اسی وقت راجیو کی وفات ہو گئی۔ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی، مگر خلاف توقع دو ہی ایک دن بعد مجھے دس لاکھ روپیہ کی رقم سونیا نے اس نوٹ کے ساتھ بھیج دی کہ یہ راجیو کی خواہش تھی''۔

25/فروری 1991 کو راجیو اور سونیا نے اپنی شادی کی 23 ویں سالگرہ تہران کے ایک ریستوراں میں ڈنر پر منائی۔ اس موقع پر راجیو نے خصوصی طیارہ بھیج کر سونیا کو بلوایا جو اس وقت امیٹھی میں دورہ کر رہی تھیں۔

آخری دفعہ راجیو گاندھی اپریل 1991 میں سونیا کے ساتھ امیٹھی گئے، وہاں کے لوگوں سے انھوں نے کہا ''اب غالباً میں آپ کے پاس دوبارہ نہ آسکوں لیکن سونیا آپ لوگوں کی دیکھ بھال کے لئے یہاں آتی رہیں گی''۔

بوفورس معاملہ نے ملک اور بیرون ملک کے قانونی اور عدالتی حلقوں میں بڑا طول کھینچا۔ 64 کروڑ کے گھپلہ کی تحقیقات اور قانونی کاروائی میں 18 برس کی صبر آزما مدت لگی اور ڈھائی سو کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ یہ قضیہ، جس کا نتیجہ راجیو کی شکست کی صورت میں نکلا، 31/مئی 2005 کو ختم ہوا جب دہلی ہائی کورٹ نے اس مقدمہ میں 3 ہندوجا بھائیوں کو بری کرتے ہوئے استغاثہ پر لتاڑ لگائی کہ وہ الزامات کو پبلک فنڈ سے کروڑوں کی رقم خرچ کر کے بھی ثابت نہیں کر پایا۔

مشہور صحافی ویر سنگھوی نے اس معاملہ پر بڑی نپی تلی یہ رائے دی ہے ''بوفورس قضیہ میں نہ تو کانگریس نے اور نہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے ہمیں سچی بات بتائی۔ کانگریس کہتی ہے کہ کارگل میں بوفورس بندوقوں نے کیسی اچھی کارکردگی دکھائی۔ بالفرض یہ صحیح ہو بھی پھر بھی اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سودے میں کوئی گھپلہ یا بدعنوانی نہیں ہوئی۔ اسی طرح بھارتیہ جنتا پارٹی کا بار بار اصرار کرنا کہ اس معاملہ میں گاندھی گھرانے کا ہاتھ تھا، سچائی کے خلاف اور مبالغہ پر مبنی ہے''۔

اندرونی کشمکش

جب 1991 میں پی.وی. نرسمہا راؤ نے 71 سال کی عمر میں ہندستانی وزارت عظمیٰ سنبھالی ان کی پبلک زندگی کے بارے میں بس لوگوں کو اتنا معلوم تھا کہ کچھ عرصہ تک آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ اور کچھ عرصہ تک مرکزی حکومت میں امور خارجہ مالیات، امور داخلہ اور انسانی وسائل کی وزارتوں کا کام سنبھال چکے ہیں۔ دہلی میں طویل قیام کی وجہ سے اب آندھرا ان کے لئے اجنبی بن چکا تھا۔ البتہ دہلی میں ان کے دوست اور مداح متعدد تھے۔ اندرا جی انھیں پسند کرتی تھیں چنانچہ ایم چنا ریڈی، برہما نندریڈی اور وجے بھاسکر ریڈی جیسے طاقتور کانگریسیوں کی مخالفت کے بعد انھوں نے ان کو کئی اہم عہدے دیے۔ وہ ان کے مشوروں پر اعتماد کرتی تھیں۔ راجیو بھی ان کے کام کرنے کے طریقہ اور بحرانی حالات میں ان کی صلاحیت اور قوت برداشت کی تعریف کیا کرتے تھے۔ بہت سے کانگریسی زعما نے راؤ کی تقرری کو عارضی اور کام چلاؤ سمجھا۔ ارجن سنگھ اور شرد پوار دونوں کا خیال تھا کہ یہ مرد بزرگ زیادہ دن تک چل نہ پائیں گے اور پھر انھیں ان کی جگہ لینے کا موقع مل جائے گا۔ سونیا ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتی تھیں بس اتنا معلوم تھا کہ وہ پارٹی کے ایک زیرک اور سینیر قابل احترام لیڈر ہیں۔ جب راؤ اندرا جی سے ملنے آتے تھے تو یہ ان کو نمستے کہتی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اندرا جی کے جنازہ کے جلوس میں راؤ اور محسنہ قدوائی راجیو کے کہنے سے آگے آگے چل رہے تھے۔ اسی لئے انھوں نے راؤ کے انتخاب پر اپنے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے نزدیکی لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر شرد پوار کو چنا جاتا تو وہ یقیناً

اعتراض کرتیں۔

اپنی شرم و جھجک کی وجہ سے راؤ اور سونیا ایک دوسرے سے بہت کم بات چیت کرتے تھے اور وجاہت حبیب اللہ اور داموردرن کے ذریعہ اپنا کام چلاتے تھے۔ وجاہت حبیب اللہ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروسز کے ایک افسر تھے جن کو راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کا خاص انتظامی افسر مقرر کیا گیا تھا جس کی صدر سونیا گاندھی تھیں اور مسٹر دامودرن راؤ کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ حبیب اللہ کا تقرر معمول کے خلاف سونیا کی مرضی کے مطابق کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ ان دونوں افسران کی وجہ سے کئی دفعہ راؤ اور سونیا کے درمیان کوئی ناخوشگوار بات بعض سینیر کانگریسی لیڈروں کی کوششوں کے باوجود نہیں پیش آئی۔ 1994 میں جب وجاہت حبیب اللہ ڈویژنل کمشنر کے طور پر سری نگر اور دامودرن امریکہ چلے گئے تو ان دونوں کے درمیان تعلقات میں شگفتگی باقی نہ رہی۔

شروع شروع میں راؤ کے اقدامات کو سونیا نے پسند کیا۔ انھوں نے ان کو راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کا ممبر بھی نامزد کر دیا۔ مگر فاؤنڈیشن کی پہلی نشست کی جگہ کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا۔ سونیا چاہتی تھیں کہ یہ جلسہ 10 جن پتھ پر کیا جائے کیونکہ وہ جذباتی بنا پر راجیو کے دفتر 7 ریس کورس روڈ میں جانا نہیں چاہتی تھیں، ادھر راؤ سرکاری ضابطوں کی بنا پر 10 جن پتھ کے خلاف تھے۔ جب راؤ کو حبیب اللہ اور دامودرن نے یہ بات بتائی تو وہ سونیا کی بات ماننے پر تیار ہو گئے لیکن اس بات کو کانگریسی حلقوں نے پسند نہیں کیا۔ فاؤنڈیشن کے جلسے برابر سونیا کی قیام گاہ پر ہوتے رہے، مگر جب ڈاکٹر شنکر دیال شرما صدر جمہوریہ ہوئے تو یہ جلسے راشٹر پتی بھون میں ہونے لگے۔

نئی حکومت کا پہلا بجٹ ڈاکٹر من موہن سنگھ وزیر مالیات نے پیش کیا جو ملک کے چوٹی کے ماہر معاشیات تھے اور ریزرو بینک کے گورنر رہ چکے تھے۔ یہ بجٹ معاشی اصلاحات اور نجکاری کی توسیع کی بنا پر قابل تعریف سمجھا گیا۔ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کو 100 کروڑ روپیہ کی امداد دی گئی جس پر حزب مخالف نے یہ کہہ کر سخت اعتراض کیا کہ ایک پرائیویٹ ٹرسٹ کو ملک کی آمدنی سے اتنی

بڑی رقم دینا کسی طرح جائز اور مناسب نہیں۔ اس معاملہ کو لے کر ملک میں خاصا شور ہوا جس سے سونیا، پرینکا اور امیتابھ بچن کو سخت صدمہ ہوا۔ راجیو کے کچھ وفادار وزرا نے وزیر اعظم پر سونیا کو پریشان کرنے کا الزام لگایا جس کے جواب میں راؤ کے طرف داروں نے ان کی خبر لی۔

راجیہ سبھا میں راجیو گاندھی کے لائے ہوئے ممبران کے گروہ نے جس میں سریش پچوری، رتنا کر پانڈے، ایس ایس اہلو والیا اور بابا مشرا نمایاں تھے بڑا شور مچایا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ راجیو اور سونیا کے خلاف کہی ہوئی ہر بات کے خلاف احتجاج کر کے اپنی شہرت کو بڑھائیں۔ چنانچہ انھوں نے سونیا پر دباؤ ڈالا کہ وہ کانگریس پارٹی کی سربراہ بن جائیں۔ انھوں نے اس معاملہ میں سونیا کو عاجز کر دیا اور ایک موقعہ پر ان کے بیانات اور رویہ سے تنگ آ کر انھوں نے ان لوگوں سے ملنے سے انکار کر دیا۔ رتنا کر پانڈے کبھی تو یہ دعویٰ کرتے کہ انھوں نے سونیا کو ہندی پڑھائی ہے اور کبھی یہ کہ وہ سونیا کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ اہلو والیا یاترا کر کے مقدس دریاؤں سے پانی جمع کر کے سری پیرمبودر گئے، مگر وہ تھوڑے ہی دن بعد سونیا کا ساتھ چھوڑ کر راؤ کے کیمپ میں آ گئے اور ان کی وزارت میں جونیئر وزیر بن گئے۔ بعد میں یہ حضرت 03-2002 میں بھارتیہ جنتا پارٹی میں شامل ہو گئے۔

راجیو فاؤنڈیشن کی گرانٹ نے عجیب پیچیدگی پیدا کر دی۔ اگر اس کو واپس لیا جاتا تو حالات اور خراب ہو جاتے۔ چنانچہ راؤ نے منموہن سنگھ کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ سونیا سے اس مسئلہ پر گفتگو کر کے حکومت کو پریشانی سے نجات دلائیں۔ منموہن سنگھ نے ہمت کر کے اور راجیو سے اپنی دوستی کا حوالہ دے کر سونیا کو پورے حالات سے مطلع کیا۔ سونیا گاندھی نے وزیر اعظم کو ایک خط بھیجا جس میں انھوں نے درخواست کی کہ بجائے فاؤنڈیشن کو براہ راست امداد دینے کے حکومت ان کے آنجہانی شوہر کی یاد میں کچھ اچھے فلاحی کام اور پروگرام شروع کرائے۔ اس طرح یہ مسئلہ حل ہوا مگر اسی وقت ایک اور جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ راجیہ سبھا کی ممبری کے لئے کرناٹک سے مارگریٹ الوا کے خلاف کچھ کانگریسیوں نے جن میں کردنا کرن اور ارجن سنگھ شامل تھے راجیو کے

پرسنل سکریٹری ونسنٹ جارج کا نام پیش کیا۔ سونیا گاندھی نے اس معاملہ میں کچھ نہیں کہا۔ راؤ روس کے دورہ پر جارہے تھے۔ انھوں نے اس معاملہ میں سونیا کی رائے دریافت کی۔ سونیا نے کہا اگر سرکار جارج کو ٹکٹ دینا چاہتی ہے تو اسے یہ فیصلہ اہلیت اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر کرنا چاہیے۔ راؤ اس کا مطلب سمجھ گئے اور امیدواروں کی فہرست میں مارگریٹ الوا کا نام ہی رہا۔

کچھ لوگوں نے 10 جن پتھ اور 7 ریس کورس روڈ کے درمیان بدظنی اور غلط فہمی پیدا کرنے کی لگاتار کوشش کی جن میں سونیا کے پرائیویٹ سکریٹری جارج نمایاں تھے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان ہی کی وجہ سے آگے چل کر پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جارج نے ان ممبران پارلیمنٹ اور کانگریسی لیڈروں کو جو راؤ کی حکومت کے خلاف تھے سونیا سے مل کر اپنی شکایتیں پیش کرنے کا مشورہ دیا اور اس کے لئے موقع بھی فراہم کیا۔ چنانچہ 10 جن پتھ پر ایسے لوگوں کی بھیڑ اکٹھا رہتی تھی۔ باہر والے جارج کے کردار اور پوزیشن کو ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں پائے۔ یا تو ان کو بڑا صاحب اثر مانا گیا یا محض ایک ادنیٰ درجہ کے بابو۔ مگر حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ 1991 سے 2001 تک کے لمبے عرصہ میں جارج سونیا کے بڑے مقرب رہے۔ وہ کانگریس کے ممبروں، صنعت کاروں، دانش وروں، مقامی کارکنوں کو اکٹھا کرنے، ان سے بات چیت کرنے اور ان سے اپنا کام نکالنے میں بڑے ماہر تھے۔ ان کے طرف دار کہتے تھے کہ جارج صاحب آدھ گھنٹے میں مشکل سے مشکل معاملہ سلجھا لیتے تھے۔ وہ بڑے محنتی، خوش اخلاق اور باصلاحیت انسان تھے۔ افسوس ہے کہ ان کو آر کے دھون اور ایم ایل فوطیدار کی طرح کوئی سیاسی انعام یا درجہ نہ مل سکا اور وہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

نرسمہا راؤ کے حریف ارجن سنگھ، کے کروناکرن، فوطیدار، نٹور سنگھ، کے این سنگھ اور شیلا دیکشت، جارج سے خوب گھلے ملے رہتے اور ان کے ذریعہ سونیا کو اجودھیا کے قضیہ، معاشی اصلاحات کی ناکامی، راجیو گاندھی کے قتل کی تفتیش میں تساہلی، سرکار کے غریب دشمن رویہ اور حکومت کی غلطیوں کی تفصیل بتائی جاتی تھی۔ جارج صاحب راؤ کے مخالفین کو سونیا سے بڑی آسانی سے ملاتے اور ان کے خلاف رپورٹوں اور اطلاعات کو اس رنگ آمیزی کے ساتھ سونیا کے سامنے پیش کرتے کہ راؤ

بڑے منظم طریقہ پرنہرو-گاندھی خاندان کو بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

وزیراعظم کو سونیا کے ساتھ ناخوشگوار تعلقات اوران کے اسباب کا علم تھا مگر انھوں نے ذاتی طور پر انھیں سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور حبیب اللہ اور دامودرن کے ذرائع پر بھروسہ کرتے رہے جو 1994 کے اوائل میں ختم ہو گئے۔

ستمبر 1991 میں امیٹھی کی پارلیمنٹری سیٹ کے ضمنی الکشن کا اعلان ہوا۔ اس وقت رتنا کر پانڈے، اہلووالیا، سریش پچوری قماش کے کانگریسی لیڈروں نے سونیا بریگیڈ بنایا اور راجیو گاندھی کی جگہ بڑے زور وشور سے سونیالاؤ کی مہم شروع کر دی۔ مگر سونیا ٹس سے مس نہ ہوئیں اوراپنے بچوں کے مشورہ پر اسی زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے دورہ کا پروگرام بنالیا، جس سے ان کے حامی ششدر رہ گئے۔ پرینکا کو اس مہم سے بڑی الجھن ہوئی، چنانچہ انھوں نے ایک دن راجیو فاؤنڈیشن کے ممبروں سے درد بھرے لہجہ میں یہ سوال پوچھا ''آخر ہم لوگ کب تک اپنی زندگی کی قربانی دیتے رہیں گے؟ ہم سیاست میں خوب حصہ لے کر دیکھ چکے ہیں!''

راؤ سونیا کے سفر کی خبر سن کر ان سے ملنے گئے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ سونیا گاندھی نے امیٹھی سے الکشن لڑنے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ جب راؤ نے ستیش شرما کو ٹکٹ دینے کے بارے میں ان کی رائے پوچھی تو انھوں نے اپنے جارج کے سلسلہ میں دیے ہوئے محتاط جواب کو دہرادیا۔ چنانچہ ستیش شرما کو اس سیٹ کے لئے کانگریس کا ٹکٹ مل گیا۔ خود انھوں نے اوران کے حامیوں نے یہ تاثر دیا کہ یہ سونیا گاندھی کی مرضی سے ہوا ہے۔

شرما نے رامائن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ بھرت کی طرح وہ یہ سیٹ بواجی کے لئے محفوظ رکھیں گے۔ وہ امیٹھی کے رائے دہندگان کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے کہ سونیا کی نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں اوروہ کامیابی کے بعد امیٹھی کا پورا خیال رکھیں گے۔

6/دسمبر 1992 میں جب بابری مسجد کی شہادت کا المیہ پیش آیا تو شاید پہلی دفعہ سونیا گاندھی نے اپنے سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے پی چدمبرم اور فاؤنڈیشن کے کچھ ممبروں کی رائے کے

خلاف ایک تیز وتند بیان اس کی مذمت میں جاری کیا۔ انھوں نے یہ دلیل یکسر مسترد کردی کہ راجیو فاؤنڈیشن جیسے غیر سیاسی ادارہ کو ایسے سیاسی معاملہ میں پڑنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ انھوں نے بانگ دہل کہا کہ وہ راجیو اور نہرو گاندھی کے دوسرے اراکین کی طرح ملک کی سیکولر روایات کو بہت عزیز رکھتی ہیں اور اگر وہ فاؤنڈیشن کی طرف سے اس کی مذمت نہیں کرتی ہیں تو وہ اپنے مقدس فریضہ سے انحراف کی مجرم قرار دی جائیں گی۔ اس بیان میں بحیثیت صدر فاؤنڈیشن انھوں نے وزیر اعظم اور مرکزی حکومت کی مذمت کی اور راؤ صاحب کو ان کی ناراضی برداشت کرنا پڑی۔ اس بیان سے سیاسی حلقوں میں ہلچل مچ گئی اور راؤ اور ان کے حلیف سمجھ گئے کہ اب 10 جن پتھ کی خاتون کھلی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وزیر اعظم نے حسب معمول اس معاملہ میں اپنی حکومت کا کوئی دفاع نہیں کیا اور نہ ہی سونیا نے اس معاملہ میں کوئی وضاحت پیش کی، جس سے غلط فہمی کی خلیج بڑھتی گئی اور ان کے مخالفین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وزیر اعظم کے کیمپ کا ہر فرد خاموش بیٹھا رہا۔ بابری مسجد کی شہادت سے قبل کانگریس پارٹی کے حلقوں میں نہرو کے دور کے خاتمہ کے متعلق چہ میگوئیاں تو ہوتی تھیں مگر کوئی کھل کر کہنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اب راؤ کے حامیوں نے ان کو چانکیہ کا خطاب دے دیا اور علم وفضل اور تدبّر میں ان کا مقابلہ جواہر لعل نہرو سے کرنے لگے۔ یہ کہا جانے لگا کہ اگر نہرو ملک کی منصوبہ بند ترقی کے معمار اعظم تھے تو نرسمہا راؤ اپنی ترقی یافتہ معاشی پالیسیوں کی مدد سے ہندوستان کو ترقی یافتہ ملک بنا دیں گے۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ لال بہادر شاستری کی طرح ہندوستان کو ایک نئی شاہراہ ترقی پر لے جارہے ہیں اور چونکہ وہ نہرو گھرانے سے باہر کے ہیں اس لئے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہے۔

1994 میں ایک غیر جانبدار ٹیلی ویژن پروڈیوسر نے اسمبلی انتخابات میں کانگریس کے پروپیگنڈہ کے لئے اس کے کارناموں کا ایک کیپسول بنایا اور راؤ کو پیش کیا مگر انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اسے اس بنا پر مسترد کر دیا کہ اس میں صرف پارٹی کے زرین ماضی اور نہرو اور

راجیو کے کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔اس واقعہ کے چند گھنٹوں کے بعد پروڈیوسر نے سونیا سے مل کر خود یہ واقعہ بیان کیا اور یہ کہا کہ اسے نہرو خاندان کی خدمات کو سراہنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔

لوک سبھا میں نرسمہاراؤ کو اکثریت حاصل نہیں تھی اس لئے شروع میں انھوں نے چانکیہ کی حکمت عملی اپناتے ہوئے چندر شیکھر، وی پی سنگھ، ہیگڑے اور بائیں بازو کے ممبران کی حمایت یہ کہہ کر حاصل کی کہ وہ نہرو خاندان کے غلبہ کو ختم کردیں گے۔ پھر وزیر اعظم نے بی. جے. پی. لیڈر اٹل بہاری واجپئی سے نجی گفتگو میں اس بات پر زور دیا کہ حزب مخالف کو ان کی حمایت اس لئے کرنی چاہیے کیونکہ وہ کسی خاص خاندان کی حکومت پر غلبہ کے مخالف ہیں۔ راؤ کے کیمپ نے کہیں ان کے برہمن ہونے اور کہیں جنوبی ہندوستان سے ان کی گہری دلچسپی، کہیں ذات پات کی سیاست اور بہوجن سماج پارٹی کو اقتدار میں آنے سے روکنے کی دلیل پیش کر کے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

غیر منقسم مدھیہ پردیش کے قبائلی علاقہ سے منتخب اور سنجے گاندھی کے خاص رفیق وی سی شکلا اس وقت راؤ کی وزارت میں پارلیمانی امور کے وزیر تھے، انھوں نے ایک غضب کی چال چلی۔ 1980 میں انھوں نے وی پی سنگھ اور ارون نہرو کے ساتھ راجیو گاندھی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اب اس وقت پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ بوفورس جھگڑے کے کاغذات جلد منظر عام پر آجائیں گے۔ یہ اطلاع ملتے ہی راؤ کے مخالف کانگریسی لیڈر لپک کر سونیا کے پاس پہنچے اور ان کو وی سی شکلا کی حرکتوں کی اطلاع دی۔ بوفورس معاملہ سے اس وقت سونیا بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ ارجن سنگھ، مادھوراؤ سندھیا اور نٹور سنگھ نے مطالبہ کیا کہ آخر راؤ شکلا کی زبان کو کیوں لگام نہیں دے رہے ہیں؟ انھوں نے یہ بھی کہا کہ راؤ اور وی پی سنگھ کی حکومت میں کیا فرق ہے۔ وی پی سنگھ تو بوفورس معاملہ میں راجیو کے شدید مخالف تھے مگر انھوں نے بس یہی کہا کہ بوفورس کے کاغذات کسی سوئس بینک کے خفیہ لاکر میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان باتوں کا سونیا پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ شروع میں راؤ اپنی کابینہ

میں ردّ و بدل سے قبل سونیا سے مشورہ کرلیا کرتے تھے مگر بعد میں ان کے صلاح کاروں نے یہ کہہ کر ان کو منع کیا کہ یہ ان کی کمزوری کی علامت سمجھی جائے گی اور دوسری طرف سونیا کو خواہ مخواہ اپنی فوقیت کا احساس ہوگا۔ اس کے بعد راؤ اور سونیا کی ملاقات میں صرف دعا سلام، راہل اور پریزکا کی تعلیم، اندرا گاندھی اور راجیو کی پرانی باتوں یا موسم کا ذکر ہوتا تھا اور پھر 10 جن پتھ پر راؤ کا جانا بھی کم ہوتا گیا۔ بہت سے کانگریسی راؤ کے قریب آنے کی کوشش میں سونیا اور جارج سے ملنے سے کترانے لگے۔ اس عرصہ میں سونیا سیاست سے الگ تھلگ رہ کر اپنے غیر ملکی ملاقاتیوں اور مہمانوں میں مگن رہنے لگیں۔ ساؤتھ بلاک میں متعین کچھ وزارت خارجہ کے افسروں نے اس بات پر ناک بھوں چڑھائی کہ یاسر عرفات، نیلسن منڈیلا اور شاہ حسین ایسی شخصیت سے ملنے کیوں آتے ہیں جس کی کوئی سرکاری یا پبلک حیثیت نہیں ہے۔ جب راؤ تک آداب شکنی کی اس قسم کی شکایتیں پہنچیں تو انھوں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن 1995 میں ساؤتھ بلاک سے یہ اطلاع سونیا گاندھی کو دی گئی کہ جارڈن کے شہزادہ عبداللہ ان سے ملنے نہ آسکیں گے اور یہ کہ اس کی بجائے انھیں خود شہزادے سے ملنے جانا ہوگا۔ سونیا نے خارجی امور کے ماہرین سے اس معاملہ میں وضاحت چاہی تو انھوں نے بتایا کہ غیر ملکی مہمان اگر چاہیں تو ان سے ملنے بے تکلف آسکتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں ہے۔ کانگریسی لیڈروں کو گمان ہوا کہ یہ تاکید وزارت خارجہ نے وزیر اعظم کے دفتر کی ایما پر سونیا کو بھیجی تھی۔

لیکن ان چھوٹے موٹے اختلافات کا راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کو ملنے والی سرکاری امداد پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ فاؤنڈیشن کے بھیجے ہوئے تمام منصوبوں پر سوشل ویلفیئر، دیہی ترقیات، وسائل انسانی اور کلچر کی وزارتیں ہمدردی سے ترجیحی بنیاد پر غور کرتی اور مدد دیتی تھیں۔ سیتارام کیسری جو اس وقت سوشل ویلفیئر محکمہ کے وزیر تھے اکثر 10 جن پتھ آیا کرتے تھے اور سونیا سے پوچھتے میرے لئے کوئی خدمت یا سیوا ہے؟ اسی طرح ارجن سنگھ اور مادھو راؤ سندھیا نے احکامات جاری کئے تھے کہ فاؤنڈیشن کی اسکیموں کو جلد منظور کر دیا جائے۔ یہی ہمدردانہ رویہ مدھیہ پردیش، ہریانہ، اڑیسہ اور

ناگالینڈ کی کانگریسی ریاستی سرکاروں کا بھی تھا۔ یہ سرکاری سرپرستی فاؤنڈیشن کو راؤ سرکار کے بعد دیوگوڑا اور اندر کمار گجرال کی یونائیٹڈ فرنٹ کی سرکاروں سے بھی ملتی رہی۔ مگر 1998 میں جب اٹل بہاری کی حکومت برسر اقتدار آئی تو صورت حال اس کے برعکس ہوگئی اور سونیا کے کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ سرکاری پالیسی میں اس تبدیلی کی وجہ سے سونیا گاندھی نے سیاست میں پورے طور پر حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ اس کے بغیر نہرو- گاندھی کی یاد میں قائم کئے گئے ٹرسٹ کوئی کام نہیں کر پائیں گے۔

راؤ کے کچھ قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں راؤ، سونیا، ستیش شرما، پچوری اور اہلووالیا کی بات سننے اور ماننے کے لئے تیار رہتے تھے مگر پارٹی کے کچھ کارکن دونوں کے درمیان غلط فہمی اور طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلاتے رہتے تھے اور خود سونیا اپنے معتمد لوگوں کے نام راؤ کو نہیں بتاتی تھیں۔ مثلاً مشہور کانگریسی لیڈر نارائن دت تیواری، جنھوں نے بعد میں ارجن سنگھ کے ساتھ مل کر ایک متوازی کانگریس پارٹی بنائی تھی جن کی رسائی وزیراعظم کے یہاں نہ ہو پائی کیونکہ راؤ کو اندازہ تھا کہ ان کو 10 -جن پتھ میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور 1991 میں جب انھوں نے نینی تال کی پارلیمانی سیٹ کے لئے اپنا پرچۂ نامزدگی واپس لینے سے انکار کیا تو راجیو گاندھی نے ناراض ہو کر اس کو ایک باغیانہ قدم قرار دیا تھا۔ ان کے ساتھیوں کا اندازہ تھا کہ تیواری جی 1991 کے الکشن کے بعد اپنی قیادت کے خواب دیکھ رہے تھے۔

لیکن راجیو کے قتل اور الکشن میں اپنی شکست کے بعد تیواری جی جو یو پی کے چار دفعہ وزیراعلیٰ رہ چکے تھے اپنی حکمت عملی بدل دی اور اپنے آپ کو راجیو گاندھی کا وفادار اور بہی خواہ بتانے لگے۔ سونیا سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس الزام کی پُر زور تردید کی کہ وہ راجیو گاندھی کی قیادت کے خلاف کام کر رہے تھے۔ سونیا جی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہیں اور اپنا کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ راؤ کو بھی تیواری جی کے اس نئے پینترہ کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے تیواری جی کو کسی قیمت پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر نہیں بنایا۔ اس پر تیواری جی کے حامیوں نے بڑا واویلا

مچایا اور یہ الزام لگایا کہ راؤ یو پی کے کانگریسی لیڈروں کو ذلیل کررہے ہیں اوران کو یقین ہے کہ جب تک پارٹی یو پی میں برسراقتدار نہیں آتی انھیں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ اس مسئلہ پر بھی سونیا اور راؤ میں غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ راؤ نے تیواری جی کے بارے میں سونیا سے کھل کر بات چیت نہیں کی۔

راجیو کے قتل کی تفتیش کے معاملہ میں بھی راؤ اور سونیا کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ راہل اور پرینکا چاہتے تھے کہ مجرموں کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچایا جائے، مگر پولس اور عدالتی چکر میں وقت ضائع ہوتا ہی رہا۔ ورما تحقیقاتی کمیٹی کی اکثر سفارشات پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ جین تحقیقاتی کمیشن نے سازش کا پتہ لگانے کے لئے اتنے زیادہ گواہ طلب کئے اور اتنے نظریے پیش کئے کہ تحقیقات کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔ کہیں تو یہ کہا گیا کہ یہ کارروائی تامل ایلم ٹائیگرس کی ہے، دوسرا نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ یہ خالصتان چاہنے والے گروہ کی کارستانی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس پر زور دیا کہ اس سازش میں امریکہ اور اسرائیل دونوں شریک ہیں۔ ایک خیال یہ بھی پیش کیا گیا کہ ہندوستان ہی کے ایک سیاسی گروہ نے راجیو کی جان لے کر ان کو راستہ سے ہٹا دیا۔

میڈیا نے ان تمام نظریوں اور قیاس آرائیوں کو اتنا پھیلایا اور مشہور کیا کہ لوگ عاجز آ گئے۔ پرینکا، راہل، ارجن سنگھ اور راجیو کے بہت سے دوست تحقیقاتی کارروائیوں پر پوری نظر رکھتے تھے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس معاملہ میں راؤ سرکار سنجیدہ نہیں ہے اور محض تضیع اوقات کررہی ہے۔ راؤ نے اپنے ایک سینیر وزیر چدمبرم کو جو راجیو فاؤنڈیشن کے ٹرسٹی بھی تھے ہدایت کی تھی کہ وہ راجیو کے قتل کیس کی تفتیش پر نظر رکھیں اور اس سے سونیا اور اس کے بچوں کو مطلع کرتے رہیں، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ وہ تامل ناڈو کی سیاست میں پڑ کر تامل منیلا کانگریس میں شامل ہو گئے اور اس پارٹی نے دراوڑ منیترا کاڑگھم پارٹی سے ہاتھ ملا کر راؤ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دراوڑ کاڑگھم پارٹی کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ اسے لبریشن ٹائیگرس سے ہمدردی تھی۔ 2002 میں تامل منیلا کانگریس، اصل کانگریس میں، جس کی صدر سونیا گاندھی تھیں، شامل ہوگئی، مگر عجیب بات یہ ہوئی

کہ چدمبرم کانگریس میں نہیں لوٹے بلکہ ایک اور چھوٹی پارٹی میں شامل ہو گئے۔

1991 سے 1996 تک شمالی ہند کے کئی کانگریسی لیڈر برابر سونیا کے اردگرد منڈلاتے رہے۔ سونیا ان لوگوں سے گفتگو تو کم کرتی تھیں لیکن وزیر اعظم کے کام کرنے کے طریقوں پر اعتراض اور ان کے خلاف شکایتوں کو دلچسپی سے سنتی تھیں۔

ارجن سنگھ نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر کوشش کی کہ سونیا جی کانگریس کے حالات کو سدھاریں۔ چنانچہ نہرو کی سیکولرازم، غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اور معتدل معاشی پالیسیوں کی آڑ لے کر ارجن سنگھ، فوطید ار اور نرائن دت تیواری نے راؤ کو سونیا سے دور کر دیا اور اسی کے ساتھ ہی راؤ کو اتنا کمزور کر دیا کی ان کی سرکردگی میں کانگریس 1996 کا الکشن ہار گئی۔

ارجن سنگھ نے یہ نعرہ بلند کیا کہ کانگریس میں ایک آدمی ایک عہدہ کے اصول پر عمل ہونا چاہیے۔ حالانکہ کانگریس، صدر کانگریس اور وزیر اعظم کے عہدوں پر ایک ہی آدمی کے ہاتھ میں اقتدار سمٹ کر آ جانے کی روایت جواہر لعل نہرو، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی قائم کر چکے تھے۔ ارجن سنگھ نے مطالبہ کیا کہ راؤ کانگریس کی صدارت چھوڑ دیں مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ اس معاملہ پر 1994 میں سورج کنڈ کے کانگریس سیشن میں ووٹنگ کرانے کی کوشش کی گئی مگر راؤ کے طرف داروں نے آوازوں کے ووٹ سے یہ ریزولوشن منظور کرالیا کہ نرسمہا راؤ کو اس اصول سے مستثنٰی رکھا جائے۔ جب اس کے خلاف سابق ہاکی اولمپک کھلاڑی اور ممبر پارلیمنٹ اسلم شیر خاں اور ان کے ساتھیوں نے احتجاج کیا تو ہریانہ کے پولس کانسٹبلوں نے جو سیوا دل کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے ان کو دھکا دیا اور سنگین نتائج کی دھمکی دی جس کی وجہ سے مخالفین کو دب کر خاموش ہونا پڑا۔

ارجن سنگھ ڈائس پر بیٹھے یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ صدر دروازہ پر اسلم شیر خاں، اجیت جوگی، دلیپ سنگھ بھوریا، کے این سنگھ، شیلا دیکشت کے ساتھ تقریباً 20 ممبران احتجاج میں دھرنے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسلم شیر خاں نے بابری مسجد کی شہادت کا مسئلہ اٹھا کر مسلمانوں کی ناراضی کی

طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے ڈائس کی طرف بڑھنا چاہا مگر پولس نے انھیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس موقعہ پر سونیا گاندھی کو ان لوگوں سے پوری ہمدردی تھی مگر وہ کھل کر اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھیں اور نہ کوئی الگ پارٹی بنانا چاہتی تھیں۔ پھر بھی اشاروں کنایوں میں انھوں نے راؤ کے مخالفین کی ہمت افزائی کی۔

ارجن سنگھ نے 25 /دسمبر 1994 کو راؤ وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ان کے ساتھ ہی نرائن دت تیواری بھی اپنے گروہ کے ساتھ راؤ سے الگ ہو گئے۔ مگر اس جھگڑے میں بازی راؤ جیت گئے کیونکہ ان کے بہت سے مخالفین نے پالا بدل لیا اور 1995 میں ارجن سنگھ کو چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ہی راؤ نے جنتا دل کے کچھ ناراض ممبروں کو اپنے ساتھ ملا کر پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر لی۔

19 /مئی 1995 کو تال کٹورا اسٹیڈیم دہلی میں کانگریس کا ایک کنونشن زور آزمائی کے لئے منعقد ہوا۔ وزیر اعظم کے خلاف تیز و تند تقریریں اس لہجہ اور انداز میں کی گئیں جس نے بھارتیہ جنتا پارٹی اور بائیں بازو کی مخالف جماعتوں کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ ان پر بابری مسجد کی شہادت، ملک کے معاشی استحکام کو داؤ پر لگانے، نہرو اور راجیو گاندھی کی پُر امن غیر جانب دارانہ پالیسیوں کی خلاف ورزی اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی رضا جوئی کے الزامات لگائے گئے اور ایسا لگا کہ کانگریس پارٹی کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ سہ پہر کو کانگریس کے کئی لیڈروں نے سونیا گاندھی سے مل کر درخواست کی کہ وہ صورت حال کو سدھارنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں۔ سونیا عجب گومگو کی حالت میں تھیں۔ انھوں نے راؤ سے براہ راست بات چیت کرنے کی بجائے مسٹر کرونا کرن کو ان کے پاس بطور سفیر بھیجا۔ ادھر راؤ اپنے خلاف گرما گرم تقریروں اور اعتراضات سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے کرونا کرن سے پوچھا ''آپ مجھ سے ان حالات میں کیا چاہتے ہیں؟ آخر میں کب تک دبتا جاؤں''۔ کرونا کرن نے ان کا یہ رویہ دیکھ کر ان سے کہا کہ سونیا جی چاہتی ہیں کہ آپ ہی اس جھگڑے کا کوئی معقول حل نکالیں۔ یہ سن کر راؤ کچھ نرم پڑے

مگر اب مفاہمت کا وقت نکل چکا تھا۔ مخالفین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے 10 جن پتھ جا کر سونیا سے کہا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور ہمارے ساتھ بے انتہا ناانصافی کی جارہی ہے۔ سونیا جی خاموش رہیں، ان کے سامنے دو راستے تھے، الگ ہو کر گمنامی کی زندگی گزارنا یا اپنے کچھ وفادار ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ کر ان کی امیدوں پر پانی پھیر دینا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے آپس کے اتحاد کو ترجیح دی اور نرمی سے راؤ مخالف گروہ سے کہا کہ وہ جو بھی مناسب سمجھیں کارروائی کریں۔ گویا ان کی طرف سے یہ خاموش پیغام تھا کہ میں تمھارے ساتھ تو ہوں مگر ابھی کھل کر لڑائی کے لئے وقت سازگار نہیں ہے۔

سونیا نے ابھی تک مئی 1995 کی واقعی روداد کسی کو نہیں بتائی۔ یہ واقعہ ہے کہ جب 1998 میں وہ کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں تو انھوں نے راؤ مخالفین کی آؤ بھگت کی اور ان کے حامیوں کو نظر انداز کیا۔ یہ صورت حال 2001 تک قائم رہی، اس کے بعد وہ کانگریس کے تیواری گروپ سے دور ہوتی چلی گئیں اور یہ وفادار بے چارے ان کی بے مہری خاموشی سے دیکھتے رہے کیونکہ ان کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ حالانکہ سونیا 19 مئی 1995 کے واقعہ سے اپنے کو بالکل لاعلم اور الگ بتاتی ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے بالواسطہ اور گول مول طریقہ سے راؤ مخالف گروہ کا ساتھ دیا اور ان کو راؤ کی مخالفت کی ترغیب دی۔ 1994 سے 1996 کے درمیان بہت سے سینیر مرکزی وزیروں نے 10 جن پتھ جانا چھوڑ دیا تھا کہ کہیں وزیر اعظم ناخوش نہ ہو جائیں۔ راؤ کے پورے دور وزارت میں سونیا کی قیام گاہ سیاسی قوت کا متبادل مرکز سمجھی جاتی رہی۔ سونیا کے حامیوں کا کہنا تھا کہ جب بھی وہ کانگریس پارٹی کو متحد رکھنے کی کوشش کرتیں تو راؤ کیمپ اس کو سیاسی چال بازی سے تعبیر کرتا اور اس کے لئے ارجن سنگھ، نارائن دت تیواری، شیلا دکشت، محسنہ قدوائی وغیرہ کو مورد الزام ٹھہراتا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ کئی سال بعد ان میں سے زیادہ تر سونیا کے مقرب اور معتمد بن گئے اور کانگریس کے اہم عہدوں پر قابض ہو گئے۔ اس سلسلہ میں راؤ کے ایک اہم طرف دار کانگریسی لیڈر کہتے تھے کہ ان کو سونیا کا غیر جانب داری یا لاعلمی کا دعویٰ غلط اور

نا قابل یقین لگتا ہے۔

اجیت جوگی اور دگ وجے سنگھ ارجن سنگھ کی پارٹی میں شامل نہیں ہوئے مگر یہ لوگ بھی سونیا کے کردار اور رجحان کا صحیح اندازہ نہ لگا پائے۔ جوگی کا بیان تھا کہ ایک دفعہ وہ چند کانگریسی ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ سونیا سے ملنے گئے اور نرسمہا راؤ کی قیادت کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی مگر وہ خاموشی سے ہماری باتیں سنتی رہیں اور ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ اگر ذرا سا بھی اشارہ کر دیتیں تو ہم سب راؤ کانگریس سے فوراً الگ ہو جاتے۔ یہی دگ وجے سنگھ بھی کہتے ہیں کہ اس صورت میں ہم لوگ ارجن سنگھ کے ساتھ مل کر راؤ کی ناک میں دم کر دیتے۔

بعض سیاسی مدبرین کا خیال ہے کہ سونیا سیاست کی چالوں کے چلنے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھیں اور اسی کا شکار راؤ مخالف گروہ بھی ہوا۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ سونیا پورے طور پر ان کے ساتھ ہیں اور وہ کنونشن میں ضرور شریک ہوں گی، مگر وہ سرے سے وہاں گئی بھی نہیں۔

کانگریسیوں کی اکثریت اپنے مفاد کی خاطر جب تک راؤ وزیر اعظم رہے ان کا ساتھ دیتی رہی مگر یہ صورت سیتارام کیسری کے ساتھ پیش نہیں آئی۔ انھیں 14 / مارچ 1998 کو کانگریس کی صدارت سے بادل ناخواستہ ہٹنا پڑا کیونکہ وہ وزیر اعظم راؤ کے برعکس صدر کانگریس کی حیثیت سے کسی کا بھلا نہیں کر سکتے تھے اور اسی لئے زیادہ تر لوگ ان کے مخالف ہو گئے۔

اس دوران سونیا کانگریس کے اندرونی جھگڑوں کو سلجھانے کی کوشش کرتی رہیں، چنانچہ 1997 میں انھوں نے کیسری کو مشورہ دیا کہ وہ ارجن سنگھ، تیواری اور ان کے ساتھیوں کو پھر سے کانگریس میں شامل کر لیں۔ کیسری نے اس مشورہ پر عمل کرنے میں تامل کیا کیونکہ ان کا دل ارجن سنگھ سے صاف نہیں تھا۔ جب سونیا نے ان سے اصرار کیا کہ وہ صلح صفائی کا اعلان کریں تو مجبوراً ان کو ماننا پڑا۔ مگر انھوں نے ارجن سنگھ اور تیواری وغیرہ کو پارٹی میں واپس آنے کی مبارکباد دینے کا کام اپنے بجائے ڈھل گا ڈگل کے سپرد کر دیا۔ ادھر راؤ اور ان کے ساتھی جوڑ توڑ میں لگے رہے اور

الکشن کے نزدیک ان لوگوں نے عوام کا انتخاب جیتنے کے لئے جین حوالہ اسکینڈل کو بے نقاب کیا جس میں مدھیہ پردیش کے دو جین بھائیوں نے چوٹی کے سیاست دانوں کو لاکھوں روپیہ کی رشوت دے کر ناجائز سرکاری مراعات حاصل کی تھیں۔نرسمہا راؤ نے سی بی آئی کے ذریعہ اس معاملہ کی جانچ کرائی جس سے معلوم ہوا کہ لاکھوں کی رشوت لینے والوں میں لال کرشن ایڈوانی، شرد یادو، ارجن سنگھ، نرائن دت تیواری، پی .شیوشنکر، مادھوراؤ سندھیا، بوٹا سنگھ، ودیا چرن شکلا، کمل ناتھ، موتی لال ووہرا شامل تھے۔اس کے جواب میں راؤ حکومت کے خلاف ان کے مخالفین نے بابری مسجد کی شہادت، کنبہ پروری کے الزامات لگائے جس میں بھارتیہ جنتا پارٹی، بائیں بازو کی جماعتیں اور مسلم عوام نمایاں تھے۔ ان معاملات نے ملک کی سیاسی فضا میں ہلچل مچادی۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ رشوت کے ایک معاملہ میں اتنی زیادہ سیاسی شخصیتیں جن کا تعلق مختلف جماعتوں سے تھا انسداد بدعنوانی کے قانون کی زد میں آئیں۔ مادھوراؤ سندھیا، ارجن سنگھ، تیواری وغیرہ نے اسے سیاسی انتقامی کارروائی اور سازش قرار دیا۔مگر نرسمہا راؤ پر کوئی اثر نہ ہوا۔انھوں نے کہا'' قانون اپنا کام خود انجام دے گا''۔مگر یہ فراخدلانہ پیشکش کی کہ جو لوگ جین حوالہ معاملہ میں نامزد کئے گئے ہیں وہ اپنی جگہ الکشن لڑنے کے لئے اپنی بیوی، بچوں یا عزیزوں کا نام پیش کر سکتے ہیں۔مگر اس تجویز کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔مادھوراؤ سندھیا نے کانگریس چھوڑ دی اور ستمبر 2001 میں ایک ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہونے تک نرسمہا راؤ سے نفرت کرتے رہے۔ جن لوگوں پر رشوت لینے کا الزام لگا تھا وہ سب مل کر نرسمہا راؤ کی مخالفت میں ایک ہو گئے اور انھوں نے ہر قیمت پر انھیں اور کانگریس کو ہرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ مدھیہ پردیش میں کانگریس کو 40 میں سے صرف 10 سیٹیں ملیں اور یہی حال دوسری ریاستوں میں بھی ہوا۔ بالکل آخر وقت راؤ کی سمجھ میں آیا کہ انھوں نے ناحق جین حوالہ قضیے کا سہارا لیا۔سی بی آئی کے ڈائرکٹر کا اس محکمہ سے تبادلہ کر دیا گیا مگر وہ بڑے سیانے نکلے اور ملازمت چھوڑ کر تیلگو دیشم پارٹی میں شامل ہو گئے اور چندر بابو نائیڈو کی وزارت میں وزیر ترقیات بن گئے۔

کئی برس بعد راؤ کے معتمدوں نے حوالہ کیس کے اچھالنے کو ایک بہت بڑی سیاسی غلطی مانا کیونکہ عدالت میں جو اندراجات اور رشوت کی تفصیلات پیش کی گئی تھیں وہ سب کمزور اور نا قابل اعتنا قرار دی گئیں۔

24/اگست 1995 کو راجیو کی پیدائش کی برسی کے موقعہ پر سونیا گاندھی نے پہلی دفعہ نرسمہا راؤ کے خلاف زبان کھولی اور اپنی تقریر میں اس بات پر افسوس اور ناخوشی کا اظہار کیا کہ وہ راجیو کے قتل کی تفتیش میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ جذبات میں ڈوبے ہوئے مجمع نے ''سونیا ملک کو بچاؤ'' کے نعرے بلند کئے۔ سونیا گاندھی تو کچھ مضطرب لگ رہی تھیں مگر ان کی بیٹی پرینکا مطمئن اور پُر اعتماد نظر آتی تھیں۔ انھوں نے اپنی ماں کے کاندھے کو تھپتھپا کر کہا ''ممی آپ ہاتھ ہلا کر ان کا شکریہ کیوں نہیں ادا کرتیں''۔

اپنی امیٹھی کی اس 7 منٹ کی تقریر میں سونیا نے لوگوں سے شکایت کی کہ راجیو کے قتل کی جانچ ٹھیک سے نہیں کی جارہی ہے۔ انھوں نے سلیس ہندی میں اپنے رنج وغم کا اظہار کیا اور کانگریس کے اندرونی جھگڑوں کے لئے مبہم الفاظ میں وزیراعظم کو قصوروار ٹھہرایا۔ انھوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ جواہر لعل نہرو اور راجیو کی بنائی ہوئی پالیسیوں اور اصولوں پر عمل نہیں کیا جارہا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ عوام اور قوم کو اس وقت ان کی ضرورت تھی۔ اس جلسہ میں صرف دگ وجے سنگھ اور سریش پچوری نے شرکت کی۔ کانگریسی لیڈروں کی اس بے رخی سے سونیا کو بڑی تکلیف پہنچی۔ اس موقعہ پر ان کے گھر والوں اور معتمد لوگوں نے مشورہ دیا کہ ان کو سیاست سے کسی طرح بھی دست بردار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ملک کو ان کی ضرورت ہے۔

راؤ نے صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے اپنے رفیقوں سے مشورہ کیا۔ ایس ایس اہلوو الیا نے کہا کہ کوئی فکر کی بات نہیں اور ہمارے بجائے ان لوگوں کو شرم آنا چاہئے جو کانگریس چھوڑ چکے ہیں۔

اسی زمانہ میں آندھرا کے الکشن میں چندر بابو نائیڈو نے زبردست کامیابی حاصل کی اور 1998 اور 1999 میں اٹل بہاری واجپئی کا ساتھ دیا۔ اسی کے ساتھ 1996 کے جنرل الکشن

میں کانگریس کو ہار کا سامنا کرنا پڑا جس پر سونیا کو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ راؤ مخالف گروہ کے لوگ پھر ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ وہ تیواری کانگریس کو حقیقی کانگریس قرار دے کر اس کی قائد بن جائیں، مگر انھوں نے سکوت کو ترجیح دی۔

الکشن کے نتائج نے ظاہر کر دیا کہ راؤ کانگریس پارٹی کو چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ گو بحیثیت وزیر اعظم وہ خاصے طاقتور اور اہم ثابت ہوئے تھے۔ سونیا دلچسپی سے شرد پوار گروپ کے نئے تشکیل شدہ یونائیٹڈ فرنٹ اور اس کے لیڈر ایچ ڈی دیوگوڑا سے بڑھتے ہوئے تعلقات کو دیکھ رہی تھیں۔ انھیں یونائیٹڈ ڈیموکریٹک کی حکومت کے برسر اقتدار آنے پر کوئی اعتراض نہ تھا بشرطیکہ اس میں ان کے اور نہرو خاندان کے مخالف رام کرشن ہیگڑے شامل نہ ہوں۔ ہیگڑے نے کیسری کے زمانے میں کانگریس میں آنا چاہا تھا مگر سونیا نے اس کی اجازت نہ دی اور کیسری کو یہ کہنا پڑا ''کیا بتائیں ہم میڈم کی اِچھا کے خلاف نہیں جا سکتے''۔

جب راؤ کی جانشینی کا سوال پیدا ہوا تو پہلے سونیا نے اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں دیا مگر جب انھیں پتا چلا کہ کیسری کا نام بھی زیرِ غور ہے تو وہ سخت حیرت میں پڑ گئیں۔ بہتوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ چال راؤ نے کانگریس سے انتقام لینے کے لئے چلی ہے جس کا اصل مقصد پارٹی کو کمزور کرنا ہے۔ سونیا کو یوں تو کیسری پسند تھے اور وہ ان کے سامنے اپنے اور اندرا جی کے گہرے خوشگوار تعلقات کا بار بار ذکر کرتے رہتے تھے مگر سونیا گاندھی کو یہ اطلاعات بھی برابر ملتی رہتی تھیں کہ وہ ان کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے ہیں چنانچہ وہ ان کی دعوتوں کو خود اندرا جی کے تاثرات کی روشنی میں ہی دیکھتی تھیں جو قطعی ان کے حق میں نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے اگر ان سے پوچھا جاتا تو وہ راؤ کے جانشین کے طور پر اے کے انٹونی کا نام تجویز کرتیں۔

1998 میں کیسری کو صدارت سے ہٹائے جانے کے بعد بھی سونیا ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں خصوصی مدعو رکن کے طور پر بلاتی رہتی تھیں۔ حالانکہ یہ رعایت انھوں نے راؤ کو کبھی نہیں دی۔ بلکہ ان کے معتمد ہمیشہ ان کو راؤ سے ہوشیار رہنے اور ان کو دور رکھنے کا مشورہ دیتے

رہتے تھے پھر بھی وہ کبھی کبھی نٹور سنگھ، منموہن سنگھ یا پرنب مکھر جی کے ذریعہ ان سے خارجی امور اور معاشی معاملات پر مشورہ کر لیتی تھیں۔ جب راؤ جھار کھنڈ مکتی مورچہ کے ممبروں کو حکومت کے حق میں ووٹ دینے کے الزام میں پھنسے تو انھوں نے کانگریس کے قانونی شعبہ سے کہا کہ وہ ان کی مدد کریں۔ مگر راؤ نے شعبہ کی اہلیت کو نظر میں رکھتے ہوئے پیشہ ور وکیلوں کو ترجیح دی اور شکریہ کے ساتھ یہ پیش کش نامنظور کر دی۔ بحیثیت مجموعی ان دونوں کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ پھر بھی 2001 میں جتیندر پرشاد کو تنظیم کے انتخابات میں ہرانے کے بعد سونیا کی دعوت پر راؤ نے کانگریس کے بنگلور اجلاس میں شرکت کی۔ سابق وزیر اعظم کو ڈائس پر، قراردادوں کے دوران مشورے دیتے اور جب بھی کوئی قرارداد رائے شماری کے لئے رکھی گئی تو اس کے حق میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا گیا۔ پارٹی کے لئے یہ ایک اچھا شگون تھا کہ جو شخص پانچ سال تک ایک اقلیتی حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلاتا رہا وہ سونیا کو مشورے دے رہا ہے۔

لیکن تعلقات میں آنے والی یہ گرم جوشی اس وقت ہوا ہو گئی جب راؤ نے اٹل بہاری واجپئی کے مقرر کردہ دستور پر ریویو کرنے کی کمیٹی کے سامنے شہادت دی جس کے صدر جسٹس وینکٹ چلیا تھے اور جس کا مقصد کسی غیر ملکی باشندے کی ملک کے اعلیٰ عہدوں پر تقرری کی مخالفت کرنا تھا۔ بعد میں سونیا کی ناخوشی دور کرنے کے لئے راؤ نے مکرجی سے کہا کہ انھوں نے کمیشن سے کوئی غلط بات نہیں کہی بلکہ سکم کو ملک میں ملانے کی اندرا جی کی کوششوں کا دفاع کیا، جسے سن کر سونیا نے خوشی ظاہر کی اور ان کی تعریف کی۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی صدارت کانگریس اور وزارت عظمیٰ ختم ہونے کے بعد نرسمہا راؤ نے سونیا گاندھی سے براہ راست جھگڑا کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ کچھ جونیئر لیڈروں جیسے متانگ سنگھ، بھونیش چترویدی اور مندر جیت سنگھ بٹا نے ان کے کان بھرے، یہاں تک کہ 2000 کے صدر کانگریس کے انتخاب میں انھوں نے اپنے خاص مقرب جتندر پرشاد کی کوئی مدد نہیں کی۔ جتیندر پرشاد، راجیش پائلٹ اور اڑیسہ، یو پی اور شمالی مشرقی ریاستوں کے کچھ غیر مطمئن

کانگریسی لیڈروں کی شہ پر سونیا کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے۔ مگر انھیں جون 2000 میں پائلٹ کی ایک جیپ کے حادثہ میں انتقال کر جانے سے بڑا دھکا لگا۔ پائلٹ ایک کارگزار اور دیانت دار انسان تھے۔ انھوں نے تانترک چندر سوامی کو گرفتار کر کے اور راجستھان کی مسجدوں کی حفاظت کر کے ناموری حاصل کی۔ وہ سونیا گاندھی کے نزدیک آنے والے ارجن سنگھ، مادھو راؤ سندھیا اور کمل ناتھ کو سیاست میں نیچا دکھانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے وہ جتیندر پرشاد کو تنظیم کے اعلیٰ عہدے پر لینا چاہتے تھے، مگر ناوقت حادثاتی موت نے ان کو یہ سب کرنے نہیں دیا۔

جتیندر پرشاد اپنی صاف ستھری شخصیت، اچھے کھانے پینے کے شوق اور اچھے اخلاق کے لئے مشہور تھے۔ وہ 1985 سے 1989 تک کانگریس کے جنرل سکریٹری اور راجیو کے پولیٹیکل سکریٹری رہے۔ راؤ کے زمانہ میں انھوں نے ارجن سنگھ، نرائن دت تیواری، محسنہ قدوائی اور شیلا دکشت کو اپنی ہوشیاری سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ پھر بھی وہ سونیا سے صدارت کے الکشن میں اس وجہ سے ہار گئے کہ وہ اس وقت کے سیاسی حالات کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور آخر تک اسی بھوکہ میں رہے کہ سونیا ان کو بلا کر مقابلہ سے ہٹ جانے کی درخواست کریں گی اور ان کو کوئی معزز عہدہ اس کے بدلہ میں دیں گی۔ نٹور سنگھ اور احمد پٹیل نے صلح صفائی کی کچھ کوشش کی مگر ارجن سنگھ اور ونسنٹ جارج کے سخت رویہ نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ بیچارے کو سونیا کے خلاف زبردست شکست ہوئی اور جو لوگ ان کو سونیا کو سبق سکھانے کی تلقین کیا کرتے تھے وہ بھی ان سے الگ ہو گئے۔ شکست کے چند ہی مہینہ کے بعد دل شکستہ جتی بھائی دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال کر گئے۔

سونیا کی سیاسی تعلیم وتربیت

نہرو۔گاندھی گھرانے میں بچوں کو تعلیم وتربیت دینے کی متعدد کشمیری، پارسی اور ہندو روایتوں پر عمل کیا جاتا رہا ہے۔ جواہر لعل نہرو کے بعد ان کی پرنواسی پرینکا گریجویٹ ہوئیں۔ اندرا جی نے رسمی تعلیم کم ہی حاصل کی اور ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی، مگر نہرو نے اپنی بیٹی کو ایسے اچھے ڈھنگ سے تاریخ، ادب، سائنس، ٹیکنالوجی اور علوم حاضرہ پڑھائے اور سکھائے کہ وہ اوسط پوسٹ گریجویٹ طالب علموں سے کہیں آگے نکل گئیں۔ نہرو جی کسی کنبہ یا خاندان کے موروثی غلبہ کے قائل نہیں تھے پھر بھی انھوں نے اندرا جی کی تربیت ایک نرالے انداز میں کی اور خطوط کے ذریعے بیٹی کو اچھی تعلیم دی۔ بدقسمتی سے اندرا جی اپنی خانگی مصروفیات، الجھی شادی شدہ زندگی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اپنے بچوں کو اس طرح کی تعلیم نہیں دے پائیں۔ راجیو گاندھی اپنی کیمبرج کی تعلیم کو محض وقت گزاری کا ذریعہ کہتے تھے۔ سنجے کی موت کے بعد مسز اندرا گاندھی نے راجیو کو سیاسی رموز اور نظم ونسق کی تربیت دینے کی طرف توجہ کی اور مختلف ماہروں سے مدد لی۔ چنانچہ راجیو کو اے پی جے عبدالکلام، پروفیسر یش پال، ایم ایس سوامی ناتھن اور پروفیسر علی محمد خسرو جیسے ماہرین اور دانشوروں سے فیض حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد اندرا نے راجیو کے چچازاد بھائی ارون نہرو کو جو ایک اچھی فضائی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ان کے ساتھ لگادیا۔ ارون نہرو بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے اپو کہلاتے تھے اور اچھی اور آرام دہ چیزوں کے شوقین ہونے کے ساتھ کام کرانے اور نگرانی میں سخت تھے۔ دو سال کے عرصہ میں راجیو پنچایتی راج کو بہتر بنانے اور

ملک کے مختلف دائروں میں موجودہ ٹیکنالوجی کو رائج کرنے اور اصلاحات لانے کے بارے میں سوچ بچار اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے رہے۔ انھوں نے ٹیکنالوجی کو ترقی دینے، الکشن میں اصلاحات، ووٹنگ کی عمر کم کرنے اور شمالی مشرقی ریاستوں میں بغاوت کو روکنے کے لئے جو خیالات ظاہر کئے ان پر کیسری سمیت کئی لوگوں نے نہ صرف تنقید کی بلکہ ان کا مضحکہ بھی اڑایا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان پر عمل درآمد کرنے سے ملک کے سیاسی و معاشرتی ماحول میں بڑی تبدیلی آئی۔ اس وقت مبصرین نے راجیو کی تجویزوں اور اسکیموں کو نئے خیالات اور ناتجربہ کاری کا ایک مجموعہ سمجھ کر کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن پھر ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ اپنی وفات سے قبل راجیو ایک تجربہ کار اور کامیاب سیاست داں بن چکے تھے۔

راجیو گاندھی کی اچانک موت نے سونیا کو عوام کے سامنے آنے پر مجبور کیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جس عجلت سے ان کو کانگریس کی قیادت سونپ دی اسے دانش ور حلقوں نے بڑی حیرت سے دیکھا۔ عوام کی اکثریت کو بھی شبہہ تھا کہ غم والم کی شدت میں سونیا گاندھی کروڑوں لوگوں کی رہنمائی ٹھیک سے کر پائیں گی۔ مگر دھیرے دھیرے ان کی یہ بدگمانی جاتی رہی۔

راجیو گاندھی کے انتقال کے تین سال بعد سینئر کانگریسی لیڈروں نے سونیا گاندھی سے درخواست کی کہ وہ نرسمہا راؤ کو قابو میں لائیں اور سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تو غمزدہ خاتون نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ اتنے بڑے ملک کے لسانی اور تمدنی اختلافات کے درمیان کیوں کر کامیاب ہوسکتی ہیں مگر ان کے حامیوں نے ایک نہ سنی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر کوئی ماں کے پیٹ سے سیاست سیکھ کر نہیں آتا۔ اور ان کو ورثہ میں ملی صلاحیت اور کانگریس کے اندر موجود لائق کارکنوں کی پُرجوش حمایت کی وجہ سے کوئی دقت نہ ہوگی۔ بہر حال سونیا نے سیاست میں داخل ہونے کا فیصلہ کرلیا مگر اسی کے ساتھ ہی وہ سیاسی داؤ پیچ کی تفہیم و بصیرت کی طرف پورے طور سے متوجہ ہوگئیں۔ ان کے مخالفین کا کہنا ہے کہ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کا قیام اسی سلسلہ کی پہلی کڑی تھی۔ مگر کانگریسی حلقے اس کو نہیں مانتے، ان کا کہنا ہے کہ سونیا نے سیاست میں آنے کا فیصلہ ملک کو

بھارتیہ جنتا پارٹی کی منصفانہ اور فسطائی حکومت سے بچانے کے لئے کیا اور راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کی بنیاد وسیع انسانی مقاصد کے حصول کے لئے ڈالی گئی تھی۔

حالانکہ سونیا، اندرا اور راجیو کو مختلف الجھے ہوئے قومی مسائل کو حل کرتے دیکھ چکی تھیں، مگر اس وقت ان کی دلچسپی بحث مباحثہ میں حصہ لینے اور مشورہ دینے تک محدود تھی، لیکن 1989 میں جب راجیو گاندھی الکشن ہارنے کے بعد دل برداشتہ ہو کر ملک چھوڑ کر اٹلی جانے کی سوچ رہے تھے اس وقت سونیا نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور ان پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا کہ وہ ملک کی سیاست میں جمے رہیں۔

1998 میں کانگریس کی صدارت سنبھالتے ہی سونیا نے اپنی ساس اور شوہر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہت سے اہم فیصلے کئے، مگر ان میں خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے اندرا اور راجیو کی طرح بار بار کانگریسی وزرائے اعلیٰ کو بدلنے کی غلطی نہیں دہرائی اور ریاستی سطح پر قیادت کو مستحکم رکھا۔ ان کے اس اقدام کو مخالفین نے ان کی کمزوری سے تعبیر کیا اور کہا کہ چونکہ وہ وزیراعظم نہیں تھیں اس لئے انھوں نے ریاستی وزرائے اعلیٰ کو ہٹانے کی ہمت نہیں کی، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس پالیسی سے کانگریسی وزرائے اعلیٰ ان سے بڑے خوش ہو گئے کیونکہ اس طرح انھیں کام کرنے کی پوری آزادی مل گئی تھی۔

اپنی صدارت کے پہلے دو برسوں میں سونیا نے صرف ایک ریاست کے وزیراعلیٰ کو ان کے عہدہ سے ہٹایا۔ وہ تھے اڑیسہ کے وزیراعلیٰ جانکی بلبھ پٹنائک۔ ان کو یہ کاروائی 1999 میں کرنا پڑی جب ہندوتو کے متعصب تشدد پسندوں نے عیسائی مشنریوں کو سبق پڑھانے کے لئے مشہور عیسائی پادری گراہم اسٹینس کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا اور وزیراعلیٰ نے تبدیلی مذہب کو روکنے کی ناجائز مہم کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی۔ سونیا کو پہلے ہی سے یہ شبہہ تھا کہ پٹنائک نرسمہاراؤ اور ان کے پرانے مخالفین سے ملے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اڑیسہ کا نیا چیف منسٹر گردھر گومانگ کو بنایا مگر بدقسمتی سے وہ ریاست کے ساحلی علاقوں میں آئے زبردست طوفان سے پیدا ہونے والے

بحران کو قابو میں نہ لا سکے۔ سونیا نے کانگریس کا ریاستی صدر پٹنائک کو بنایا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور کانگریس کو اسمبلی کے انتخابات میں 137 میں سے صرف 10 نشستیں ملیں۔ اس شکست سے سونیا کو یہ سبق مل گیا کہ کسی چیف منسٹر کو ہٹانا مناسب نہیں۔ چنانچہ انھوں نے دگ وجے سنگھ، شیلا دکشت، ایس ایم کرشنا، ولاس راؤ دیش مکھ کے مخالفین سے صاف کہہ دیا کہ وہ ان کے کہنے سے کسی بھی وزیر اعلیٰ کو نہیں ہٹائیں گی۔ اس میں ایک استثنیٰ مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ دیش مکھ کے بارے میں 2003 میں ہوا جب انھیں ریاستی کانگریس لیڈروں اور مخلوط حکومت کی ساجھے دار نیشنلسٹ کانگریس پارٹی کے متحدہ مطالبہ پر ہٹایا گیا۔ اس پالیسی کو اس وقت پندرہ ریاستوں کے کانگریسی وزرائے اعلیٰ نے بہت سراہا۔ اس طرح سینئر کانگریسی لیڈروں اور وزیروں کی خفیہ سازشوں اور کوششوں کا خاتمہ ہوا جس کا سلسلہ اندرا، راجیو اور نرسمہا راؤ کے زمانہ میں برابر چلتا رہتا تھا۔

یہ بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ راجیو کے مقابلہ میں سونیا زیادہ اچھی مردم شناس ہیں۔ راجیو اکثر میٹھی، چکنی چپڑی باتوں اور جذبات کی رو میں، لوگوں کی باتوں میں آجاتے تھے، مگر سونیا کی عقابی آنکھوں، محتاط رویہ اور پُر معنیٰ سکوت سے لوگ خائف اور چوکنا رہتے تھے۔

شروع شروع میں ان سے اور شرد پوار سے شگفتہ تعلقات نہیں تھے حالانکہ شرد پوار نے کانگریس پارٹی کے فیصلہ کے مطابق سونیا سے مل کر درخواست کی تھی کہ وہ کانگریس کو بچانے کے لئے آگے آئیں۔ مگر وہ ان کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور ان سے کم ہی ملتے اور بات چیت کرتے تھے۔ جب سونیا کے غیر ملکی نژاد ہونے کا مسئلہ کھڑا ہوا تو پوار نے کھل کر ان کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس معاملہ پر سونیا ان سے صفائی سے بات چیت نہیں کریں گی۔ مگر یہی بات پوار کے مخالف اُن کے لئے بھی کہتے ہیں اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں وہ اسی بنیاد پر ان کے خلاف ایک ملک گیر مہم چلانا چاہتے تھے۔

معلومات حاصل کرنے اور سیکھنے کے جذبہ سے سونیا تاریخ داں، سماجیات کی ماہر زویا حسن،

قانون داں رومیلا تھاپر، پی این بھگوتی، انٹیلی جنس بیورو کے سابق چیف ایم کے نارائنن، سیاسی و سفارتی ماہرین جے این دکشت، ابھیشیک سنگھ، نٹور سنگھ اور پرنب مکھرجی سے برابر ملتی رہتیں اور تاریخی، سیاسی اور معاشرتی امور پر تبادلۂ خیال کیا کرتی تھیں۔ غیر رسمی طور پر ان لوگوں نے بتایا کہ سونیا پوری توجہ اور ذوق وشوق سے ان کی باتیں سنتی تھیں، وہ بولتی کم تھیں اور سنتی زیادہ تھیں۔ اکثر نکات کو وہ لکھ بھی لیا کرتیں۔ ان کا یہی رویہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں بھی رہتا تھا۔

اچھی طالب علم ہونے کے باوجود ان سے کبھی چھوٹی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ مثلاً ایک مرتبہ مشہور انقلابی بھگت سنگھ کی یاد میں ہونے والی ایک تقریر کی ریہرسل میں بار بار سونیا گاندھی نے ان کا نام سردار بھگت سنگھ پڑھا۔ مگر جب انھوں نے تصویر میں انھیں پگڑی کے بجائے ہیٹ پہنے دیکھا تو تقریب میں انھوں نے اپنی تقریر نہیں پڑھی اور صرف ایک گلدستہ ان کی تصویر پر رکھ دیا۔ بعد میں لوگوں کو اس پر بڑا لطف آیا۔

ایک ایسا ہی واقعہ اور پیش آیا۔ ایک دفعہ مادھوراؤ سندھیا نے ان سے اتر پردیش کی ایک اہم ذات کے لیڈر کو ملایا جو سماج وادی اور بھارتیہ جنتا پارٹی میں رہ چکے تھے۔ انھوں نے اتر پردیش میں ذات پات کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا۔ مگر سونیا نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور یہ کہا کہ وہ صدر کانگریس کی حیثیت سے ذات پات کی قائل نہیں۔ ان کی یہ بات سنتے ہی وہ لیڈر یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ اب میں آپ کے پاس اس وقت آؤں گا جب آپ اتر پردیش میں ذات پات کی اہمیت سمجھ جائیں گی۔

اپنی اس ٹریننگ کے دوران سونیا جو کچھ سیکھتی تھیں اس کا اظہار اپنی مختصر تقریروں میں بھی معاشی معاملات کو چھوڑ کر کیا کرتی تھیں۔ البتہ وہ معاشی معاملات، پالیسی اور مسائل کے حل کے مباحثات و مذاکرات میں پوری دلچسپی لیتی تھیں لیکن اظہار خیال سے پرہیز کرتی تھیں۔ اس معاملہ میں وہ ڈاکٹر منموہن سنگھ کی لیاقت اور تجربہ سے بہت مرعوب تھیں۔ چنانچہ ان کی 1991 کی معاشی اصلاحات سے متاثر ہو کر انھوں نے نہ تو بائیں بازو کی طرف کار جحان رکھنے والے کانگریسیوں ارجن سنگھ، انٹونی،

منی شنکر ایر کی بات مانی اور نہ ان لوگوں کی جو معاشی معاملات میں اعتدال پسند تھے۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ پر ان کے بھروسہ کو دیکھ کر مادھو راؤ سندھیا اور بہت سے لیڈر سمجھ گئے تھے کہ سونیا ان کو اتنا پسند کرنے لگی ہیں کہ ایک دن ان کو ملک کا وزیر اعظم بنا کر چھوڑیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سیاست میں آنے سے قبل سونیا مختلف ذریعوں سے ہندی سیکھنے لگی تھیں۔ شادی کے بعد ہی اندرا جی نے ان کے لئے ہندی پڑھانے کے لئے استاد کا انتظام کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ہندی لکھنا پڑھنا سیکھ گئیں۔ وہ خود کہتی تھیں کہ مجھے تو ہر حال میں ہندی سیکھنا ہی تھی کیونکہ موتی لعل نہرو کے زمانہ سے کنبہ میں یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ رات کے کھانے پر ہر ایک ہندی میں بات چیت کرتا تھا۔ شروع شروع میں بچے ان کے ہندی تلفظ اور لہجہ پر ہنسا کرتے تھے مگر اندرا اور راجیو برابر ان کی غلطیوں کو درست کرتے رہتے۔ ایک دفعہ سونیا نے راجیو گاندھی کو غلط ہندی بولنے پر ٹوکا تو سب کو بڑا لطف آیا، اور اب وہ ہندی ریاستوں کے باشندوں سے بڑی بے تکلفی سے ہندی بول لیتی ہیں۔ پارلیمنٹ میں منتخب ہونے کے بعد ان کو وہاں کی روایات اور طور طریقوں پر مفید معلومات پروفیسر پی جے کورئین، مادھو راؤ سندھیا، شیوراج پاٹل، فوطیدار، ارجن سنگھ، پی ایم سعید، پون بنسل وغیرہ سے ملیں۔ شروع میں پارلیمنٹ میں انھیں گھبراہٹ ہوئی کہ ایوان اور پریس گیلری سے سینکڑوں آنکھیں ان کی نقل وحرکت کو دیکھ رہی ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ انھیں ونسنٹ جارج اور پولک چٹر جی کی مدد ایوان میں نہیں مل سکتی تھی۔ جب پارلیمنٹ ملتوی ہوئی تو انھیں بڑی طمانیت ہوئی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کو ان کے ایوان کی کارروائیوں میں کم حصہ لینے اور خاص کر تقریر سے پرہیز کے معاملہ میں خاصی تشویش ہے۔ مگر وہ اپنے ساتھیوں سے کہتی تھیں کہ تھوڑے دنوں بعد یہ کیفیت جاتی رہے گی۔ چنانچہ 29/ اکتوبر 1999 کو انھوں نے پارلیمنٹ میں پہلی تقریر کی۔ اس سے قبل وہ تین دفعہ اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کے خیر مقدم میں بلاری سیٹ سے اپنے استعفے کے اعلان میں مختصر الفاظ بول چکی تھیں۔ بلاری (کرناٹک) اور امیٹھی (یوپی) دونوں

جگہوں سے وہ پارلیمنٹ میں منتخب ہوئی تھیں۔ وہ اس تقریر کے لئے تیاری کر کے آئی تھیں اور ان کے ہاتھ میں 30 ٹائپ شدہ صفحات تھے جن کو پڑھنے کے دوران جی ایم سی بالا یوگی نے ان کی بڑی ہمت افزائی کی۔ کیونکہ ان کے اٹک اٹک کر بولنے یا غلط تلفظ کا حزب مخالف بڑا مذاق اڑا رہا تھا۔ اسپیکر صاحب کو خود اپنی مصیبت یاد آ گئی کیونکہ وہ بھی ہندی روانی سے نہ بول سکتے تھے، مگر اس تقریر سے سونیا کی دھاک بیٹھ گئی، انھوں نے اپنی تقریر میں واجپئی سرکار کو طنزیہ لہجے میں کانگریس کی چلائی ہوئی معاشی اصلاحات پر عمل کرنے پر مبارک باد دی اور پھر جذباتی لہجہ میں بوفورس معاملہ پر سرکار کے غیر منصفانہ رویہ پر سخت احتجاج کیا۔ انھوں نے مرکزی تحقیقاتی ایجنسی پر ایک ''ناکردہ گناہ'' فرد (راجیو گاندھی) کو پھنسانے کا الزام لگایا اور غصیلے انداز میں اسے سیاسی انتقام کی سازش کا نام دیا۔ گو حکومت نے راجیو گاندھی کا نام فرد جرم سے نکالنے پر اپنی معذوری ظاہر کی پھر بھی ان کی تقریر نے کانگریس کے ممبروں پر اچھا اثر ڈالا۔ انھیں اپنے محبوب لیڈر کا مسکراتا چہرہ سونیا کی شکل میں نظر آیا اور وہ سونیا کی قیادت پر مطمئن ہو گئے۔

پھر بھی ایوان میں بحیثیت لیڈر حزب مخالف سونیا زیادہ نمایاں یا مؤثر ثابت نہیں ہوئیں وہ زیر بحث مباحثوں کے لئے حکمت عملی طے کرتیں، مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کرتیں مگر گورنمنٹ پر حملہ کرنے کے لئے وہ مادھو راؤ سندھیا، پریہ رنجن داس منشی، منی شنکر ایر، جے پال ریڈی وغیرہ کو آگے بڑھا دیتی تھیں اور خود پیچھے رہ کر خاموش رہتیں۔ یہ محسوس کیا گیا کہ تہلکہ اور یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے قضیوں اور واجپئی مشرف کی آگرہ میں چوٹی کانفرنس کی ناکامی سے کانگریس پارلیمانی پارٹی پورا فائدہ نہیں اٹھا سکی۔

تہلکہ قضیہ میں محکمہ دفاع کے کچھ افسروں اور نیشنل فرنٹ کے کچھ اہم عہدہ داروں پر مختلف سودوں میں رشوت لینے اور مالی بدعنوانیوں کے الزامات لگائے گئے تھے، اسی طرح یہ بھی پتہ چلا کہ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں پیسہ لگانے والوں کی جمع پونجی غارت ہو گئی تھی۔ ان موقعوں پر اگر بحیثیت قائد حزب مخالف سونیا گاندھی، ملائم سنگھ یادو، چندر شیکھر، مایاوتی، شرد پوار وغیرہ دوسری

مخالف پارٹیوں کے لیڈروں کو اپنے ساتھ پورے طور پر شریک کرلیتیں تو حکومت سخت مخمصہ میں پڑ جاتی۔ مگر انھوں نے اپنی شرم و جھجک کی وجہ سے ان لوگوں سے براہ راست رابطہ قائم نہیں کیا اور جے پال ریڈی اور ہرکشن سرجیت اور سومناتھ چٹرجی کے ذریعہ ان سے بات چیت کرنا مناسب سمجھا جس کا ملائم سنگھ یادو اور امر سنگھ نے برا مانا اور اس کو سونیا کی ناکامی سے تعبیر کیا۔ اسی طرح مایاوتی، پوار اور اجیت سنگھ کی مدد حاصل کرنے کے لئے انھوں نے پریہ رنجن داس منشی پر بھروسہ کیا۔ شروع میں یہ طریقہ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ خاص طور پر اجودھیا کے معاملہ میں کانگریس اور سماج وادی پارٹیاں مل کر حکومت پر زوردار حملہ نہ کر پائیں۔ گو ملائم سنگھ اتر پردیش میں سونیا کی .بیت سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی کے مقابلہ میں کانگریس کو اپنا زیادہ طاقتور حریف تصور کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی پارٹی کے ایک ممبر پارلیمنٹ سے جو انھیں فرقہ پرست بھارتیہ جنتا پارٹی کو اقتدار سے دور رکھنے کے لئے سیکولر کانگریس سے ہاتھ ملانے کی ترغیب دے رہے تھے کہا ''دیکھ بھائی، بی جے پی تو ہمیں ٹکنے کا موقعہ دے گی مگر کانگریس تو اتر پردیش سے ہم کو ختم کر کے رہے گی''۔

اس صورت حال کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ الکشن میں کانگریس اور ملائم سنگھ دونوں کو ہار کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی ملائم سنگھ نے افغانستان پر امریکہ کی بمباری اور دہشت گردی کے خلاف سخت کارروائیوں کی حمایت میں واجپئی سرکار کا ساتھ دیا، جب کہ کانگریس نے اس کی مذمت کی۔ پھر بھی جب 2002-2003 میں اتر پردیش میں بی جے پی. اور بہوجن سماج پارٹی کی ملی جلی حکومت بنی تو امر سنگھ اور کچھ بااثر صنعتی گھرانوں کے ذریعہ کانگریس اور سماجوادی پارٹی کے درمیان خوشگوار دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔

کانگریس مخالف لیڈروں میں سونیا کے جیوتی باسو اور ہرکشن سنگھ سرجیت سے خصوصی اچھے تعلقات تھے، چنانچہ 1999 میں پوار نے سونیا کے غیر ملکی ہونے کے خلاف ملک گیر مہم شروع کی تو سونیا سرجیت سے ملنے ان کی تین مورتی لین کی قیام گاہ پر گئیں اور دونوں لیڈروں نے سرجیت

کی خواب گاہ میں ان کی لڑکی کی موجودگی میں بیٹھ کر بات چیت کی۔ دوران گفتگو سرجیت نے سونیا کو بتایا کہ اندرا جی نے کس حکمت عملی سے پرانے اور تجربہ کار کانگریسی لیڈروں کو چاروں خانے چت کر دیا تھا۔ پھر انھوں نے سونیا کو دو گر کی باتیں یہ کہہ کر بتائیں ''بیٹی ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور یہاں کے لوگ دکھاوے کی اصلاحات کے پروپیگنڈہ میں نہیں آتے۔ کانگریس نے ہمیشہ غریبوں کا ساتھ دیا ہے اس لئے تم بھی کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑنا، دوسری بات یہ کہ اقتدار کے لالچ میں کبھی فرقہ وارانہ طاقتوں سے ہاتھ نہ ملانا۔ جیسا وی پی سنگھ نے بی جے پی سے مل کر اپنی سرکار چلانا چاہی مگر وہ ناکام رہے''۔ سونیا کے دل میں بزرگ رہنما کے یہ دونوں منتر اتر گئے اور وہ ان کی ہمیشہ ممنون رہیں۔

اگست 2007 اور جولائی 2008 میں سونیا گاندھی کو یونایٹڈ پروگریسیو محاذ اور بائیں بازو کی جماعتوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنے کے لئے سرجیت کی بہت یاد آئی۔ اس وقت امریکہ سے نیوکلیائی معاہدہ کے بارے میں حکومت اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت سرجیت 92 سال کے ہو چکے تھے اور سخت بیمار بھی تھے اس لئے وہ سونیا، منموہن سنگھ اور پرکاش کرات اور ان کے پُر جوش حامیوں میں مفاہمت نہ کرا سکے۔ کرات نے نجی طور سے سونیا پر دھوکہ بازی کا الزام لگایا جس سے انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔

1998 اور 2004 کے درمیان پارلیمنٹ میں سونیا گاندھی کو ان کی ناتجربہ کاری اور خود اعتمادی کی کمی کی بنا پر سرکاری بنچوں نے کئی دفعہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ مگر سرکار کے ہر حملہ اور ان کو نیچا دکھانے کی ہر کوشش کے جواب میں سونیا گاندھی خاموشی کے باوجود مقابلہ کی تیاری کرتی رہتی تھیں۔ جب اٹل بہاری واجپئی نے نیوکلیائی معاملہ میں کانگریس کے موقف کا مذاق اڑایا تب بھی سونیا گاندھی خاموش رہیں اور کانگریسی بنچوں پر خاموشی چھا گئی۔ مگر اسی کے بعد سونیا نے ان معاملات کے ماہرین سے مل کر مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھا اور پھر اس موضوع پر پارلیمنٹ میں 12/ مارچ 2001 کو تقریر کی جس میں وزیراعظم واجپئی کے طنزیہ فقرہ کے جواب

میں ان سے پوچھا ''آپ اس روز کانگریس اور مجھ پر یہ کہہ کر ہنسے تھے کہ ان کو اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ اب میں وزیر اعظم سے پوچھتی ہوں جو 50 سال کا پارلیمانی تجربہ رکھتے ہیں اور طنز و مزاح میں بھی ماہر ہیں کہ خود ان کی حکومت اس بارے میں کیا جانتی ہے۔ اٹھارہ مہینہ سے زیادہ ہو گئے آپ کے مقرر کردہ نیشنل ایڈوائزری بورڈ نے آپ کی سرکار کو اپنی سفارشات بھیجی تھیں۔ آپ نے اس پر کوئی پالیسی ابھی تک نہیں اپنائی۔ جب تک ایسے اہم قومی مسئلہ پر حکومت کوئی واضح پالیسی کا اعلان نہیں کرتی، حزب مخالف کیا کرے، کیا ہم ایسی پالیسی کی حمایت کریں جس کا وجود ہی نہیں''۔ اس تقریر کو بہت پسند کیا گیا اور سونیا کی ہمت اور بڑھ گئی۔ چنانچہ جب 26/مارچ 2002 کو دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں انسداد دہشت گردی کے آرڈیننس پر بحث شروع ہوئی تو سونیا نے بڑے اعتماد سے واجپئی پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے یہ آرڈیننس سنگھ پریوار کے دباؤ میں آکر اور ان کو خوش کرنے کے لئے پیش کیا ہے۔ یہ سن کر واجپئی جی آپے سے باہر ہو گئے اور سونیا کے لب ولہجہ پر اعتراض کرنے لگے۔ ان کے اس رویہ پر کانگریسی ممبران پارلیمنٹ دنگ رہ گئے۔ وہ یہ سمجھ نہیں پائے کہ آخر حزب مخالف کے لیڈر کی تقریر میں کیا بات تھی جس سے وزیر اعظم غصہ سے بے قابو ہو گئے۔ کچھ کانگریسیوں کا کہنا ہے کہ واجپئی اس طرح کا حملہ کرنے کے لئے موقعہ کی تاک میں تھے اور اس وقت گجرات اور اجودھیا کے واقعات سے بھی پریشان تھے چنانچہ انھوں نے سونیا کے اس الزام پر بہت برا مانا کہ یہ آرڈیننس سنگھ پریوار کے دباؤ کی وجہ سے پیش ہوا۔ ان کے ہیجان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عین اسی زمانہ میں بہت سے بائیں بازو کے ممبروں نے ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ امریکہ کے دباؤ ڈالنے کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ واجپئی نے اپنی مختصر تقریر میں یہ بھی کہا کہ ایک کانگریسی وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے نیوکلیر ٹسٹ کو عین وقت پر ایک غیر ملکی طاقت کے دباؤ کی وجہ سے منسوخ کر دیا تھا جب کہ 1999 میں وہ (یعنی واجپئی) کارگل کی لڑائی کے موقعہ پر صدر کلنٹن کی دعوت کے باوجود امریکہ نہیں گئے، حالانکہ پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف وہاں پہنچ چکے تھے۔

اسی طرح صدر کے شکریہ کی تحریک میں بولتے ہوئے واجپئی نے سونیا کے اس جملہ پر اعتراض کیا کہ 2002 میں گجرات کے فسادات میں قتل عام سفاکی سے ہوا تھا۔ انھوں نے سونیا کو آگاہ کیا کہ وہ ایسے سخت اور درشت الفاظ نہ استعمال کریں جن کے بین الاقوامی اثرات مضر ہو سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر بھی وزیر اعظم اور حزب مخالف کے درمیان ذاتی تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے، اور رسمی گفتگو، خطوط یا سرکاری افسروں کے ذریعہ ہوتی رہتی تھی۔ چونکہ 2002 میں کانگریس چودہ ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں اقتدار پر قابض تھی جن میں مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، مہاراشٹر، راجستھان، دہلی، آسام، کیرالا، کرناٹک، ناگالینڈ، اروناچل، منی پور وغیرہ شامل تھے یعنی آدھے سے زیادہ ملک پر۔ اس لئے واجپئی جی کانگریس کو اور خاص کر سونیا کو اور زیادہ نشانہ بنانا چاہتے تھے۔

واجپئی سونیا کے جھگڑے میں ایک اور لطیفہ ہوا۔ واجپئی نے تقریر میں کہا ''وہ (سونیا) مجھ کو کٹہرے میں کھڑا کرنے والی کون ہوتی ہیں''۔ یہ سن کر ارجن سنگھ نے فوراً سونیا کی حمایت میں اپنا نکتہ احتجاج اسپیکر کے سامنے پیش کیا۔

سونیا کی سیکھنے کی لگن کو کانگریس میں ہر طرف سراہا گیا۔ انھوں نے سیاسی معاملات کے متعلق ایک بڑی کمیٹی بنائی جس کے جلسے پارلیمانی اجلاس کے زمانے میں ہوتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر منموہن سنگھ، نٹور سنگھ، پرنب مکھرجی، سلمان خورشید، منی شنکر ایّر وغیرہ حصہ لیتے تھے اور سونیا ان میں خاص دلچسپی لیتی تھیں۔ سیکولرازم، اجودھیا، تعلیم پر فرقہ وارانہ اثرات وغیرہ کے معاملات میں وہ ارجن سنگھ، فلیریو، کے ایم خان، جناردھن دویدی، رومیلا تھاپر سے مدد لیتی تھیں، قانونی معاملات میں کپل سبل، بھاردواج، شیوشنکر سے مشورہ کرتی تھیں، اور سرکار سے نپٹنے کے لئے وہ منموہن سنگھ، مادھوراؤ سندھیا، نٹور سنگھ اور جے رام رمیش کو آگے بڑھاتی تھیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ جون 2001 میں نٹور سنگھ نے برجیش مشرا کو اپنے تعلقات سے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ سونیا گاندھی اقوام متحدہ اسمبلی میں ایڈس اور جنسی امراض کے موضوع پر تقریر کریں۔ حالانکہ اس

بات سے ہندستانی وفد کے لیڈر اور مرکزی وزیر صحت مسٹر سی پی ٹھاکر ناخوش ہو گئے۔ اسی طرح نٹور سنگھ نے امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی اور امریکی انتظامیہ کے اہم افسروں سے سونیا کو ملوانے کا انتظام کر دیا، جب وہ پہلی دفعہ حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے اپنے امریکہ کے پہلے دورہ پر گئیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاید اسی بنا پر سونیا نے تہلکہ معاملات میں جو میمورنڈم صدر جمہوریہ کو پیش کیا اس میں وزیراعظم واجپئی کے استعفیٰ کا مطالبہ نہیں کیا۔

امریکہ کے دورے نے سونیا کے اعتماد کو بہت بڑھا دیا۔ وہاں وہ بے تکلفی سے ہر ایک سے ملیں اور اپنی ذہانت اور حسِ مزاح اور شخصیت کا سکہ جما دیا۔ جس سے این ڈی اے سرکار اور بھارتیہ جنتا پارٹی دونوں تلملا گئیں۔ ایک بی جے پی ممبر پارلیمنٹ دینا ناتھ مشرا نے اپنی کتاب ''سونیا-ایک گمنام ہستی'' میں ان پر بہت سے بے بنیاد اور لچر الزام لگائے حالانکہ انھیں سونیا کو ان کی پارٹی نے جون 2001 میں اقوام متحدہ کی ایڈس کانفرنس میں بھیجا تھا جہاں انھوں نے اپنا کردار بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا اور یہ وضاحت کی کہ سیاسی اختلافات کے باوجود ان کی پارٹی (کانگریس) غریبی، بیماریوں اور ملک کی فلاح کے کاموں میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی حکومت کو پورا تعاون دے رہی ہے۔

کانگریس کی صدر ہونے کے کچھ ہی دن بعد سونیا نے سنگما کو ہدایت کی کہ وہ پارٹی کے کام کرنے کے طریقوں اور اس کو عصری تقاضوں کے مطابق چاق وچوبند بنانے کے لئے اپنی سفارشات ایک رپورٹ میں ان کو پیش کریں۔ چنانچہ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں فرش اور گاؤ تکیوں کا استعمال، کھادی کا لازمی طور پر پہننا اور پارٹی ممبروں کو شراب سے مکمل پرہیز کرنے کا حکم، اکیسویں صدی کے کلچر اور تقاضوں سے میل نہیں کھاتا۔ مگر قبل اس کے کہ سونیا ان سفارشات کا جائزہ لیتیں سنگما کانگریس کو چھوڑ کر چلتے بنے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی رپورٹ آج بھی 24/اکبر روڈ کے ردی خانے میں کوڑے کے ڈھیر میں پڑی ہوئی ہے۔

فروری 2000 میں کانگریس پارٹی کے معیار اور کارکردگی کو بلند اور جدید بنانے کے لئے

سونیا نے سائنس، ٹیکنالوجی، ماحولیات، انسانی حقوق، اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح، عوامی رابطہ قائم کرنے، امور خارجہ، رسل ورسائل، پلاننگ وغیرہ کے متعدد شعبے قائم کئے جن میں کام کرنے کے لئے 144 آدمیوں کو مقرر کیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ پارٹی کے زیادہ تر لیڈروں نے سکریٹریٹ اسٹاف، فیکس، ٹیلی فون اور کمروں کی سہولتیں مانگنے کے علاوہ ان کاموں میں خاص دلچسپی نہیں لی۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ پارٹی میں ہمہ جہتی اتحاد اور یکجہتی قائم رہے، چنانچہ ہر مہینہ ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں تمام معاملات پر آزادانہ بحث مباحثہ کی اجازت تھی مگر یہ جمہوری طریقہ تھوڑے ہی دن چلا اور اس کی جگہ کچھ خاص لوگوں کی ٹولی اور اسی کی رائے کو فوقیت دی جانے لگی۔ اور خود سونیا بھی ارجن سنگھ، ونسنٹ جارج اور نٹور سنگھ کے مشوروں پر عمل کرنے لگیں۔

کانگریس پارٹی کے لیڈروں نے محسوس کیا کہ سونیا میں راجیو والی گرم جوشی تو نہیں پائی جاتی لیکن وہ نرسمہاراؤ کی طرح لوگوں سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہیں رہتی تھیں۔ وہ اپنی ذاتی اور پبلک زندگی میں فرق رکھنا چاہتی تھیں اور ملنے والوں سے تھوڑا فاصلہ بھی رکھنا چاہتی تھیں۔ مثلاً وہ اتوار اپنے لئے خالی رکھنا چاہتی تھیں۔ دگ وجے سنگھ اور کئی ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ نے ان سے ملنے کی اتوار کو کئی دفعہ کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی طرح جلسوں میں وہ موبائل فون رکھنے کی اجازت نہ دیتی تھیں اور دفتر کے ہر عہدے دار کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی نقل وحرکت سے صدر کو ہمیشہ مطلع رکھے۔

وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ جلسوں میں لوگ تیاری کر کے آئیں، چنانچہ ایک دفعہ انھوں نے شیلا دکشت، وزیر اعلیٰ دہلی اور ولاس راؤ دیش مکھ وزیر اعلیٰ مہاراشٹر کی خبر لی جب وہ اقلیتوں، پسماندہ ذاتوں اور قبیلوں کی فلاحی اسکیموں کے بارے میں ان کے سوالات کا تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ انھوں نے ناگواری سے کہا ''آپ کو پورے طور پر تیار ہو کر آنا چاہیے تھا۔ ایسی میٹنگوں کا کیا فائدہ جس میں وزیر اعلیٰ معلومات نہ فراہم کر سکیں''۔ سونیا کے زمانہ میں یوں تو ہر ایک کو کام کرنے کی

آزادی حاصل تھی لیکن اس کے ساتھ ہی جواب طلبی کے ضابطہ پر پوری سختی سے عمل ہوتا تھا۔ وہ غلطی کرنے والے کو معاف نہیں کرتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے پرنب مکھرجی کو کانگریس کے جنرل سکریٹری کے عہدہ سے اس لئے ہٹا دیا تھا کیونکہ انھوں نے ہریانہ میں بنسی لال کی لڑکھڑاتی ریاستی حکومت کا ساتھ دیا اور جن کی غلطیوں سے ہریانہ میں کانگریس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ بعد میں پرنب مکھرجی نے لاکھ معذرت کی مگر سونیا نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ بس ان کو یہ رعایت دی گئی کہ وہ ریاستی الکشن میں ہارنے کی اخلاقی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیں۔ یہی حشر غلام نبی آزاد کا بھی ہوا۔ ان کو سونیا نے کانگریس جنرل سکریٹری سے ہٹا کر جموں اور کشمیر ریاستی کانگریس کا صدر بنا دیا۔ جہاں اس وقت بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ حالانکہ آزاد گزشتہ دس سال سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اہم رکن تھے اور راجیو سے گہرے قریبی تعلقات رکھتے تھے اور کچھ عرصہ تک سیتارام کیسری اور پھر نرسمہا راؤ سے بھی ان کے اچھے مراسم رہے تھے۔ سونیا کی ناراضی کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو وہ کیرالا کے وزیر اعلیٰ اے کے انٹونی اور ان کے حریف کرونا کرن کے درمیان صلح نہ کرا سکے اور پھر فروری 2002 میں اترانچل میں انھوں نے نارائن دت تیواری کے خلاف ہریش راوت کی حمایت وزارت عظمیٰ کے لئے کی جب کہ ممبران اسمبلی تیواری کو چاہتے تھے اور آخر میں یوپی کے الکشن میں کانگریس کی شرمناک شکست اور ان کی ملائم سنگھ یادو سے قربت انھیں مہنگی پڑی۔ آزاد کو ہٹائے جانے سے سونیا کی دھاک جم گئی اور سینئر کانگریسی لیڈر اُن کے کام کرنے کے طریقوں اور ان کی ناخوشی سے خائف ہونے لگے۔

مگر اس وقتی سزا سے غلام نبی آزاد کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ 2005 میں جموں اور کشمیر ریاست کے وزیر اعلیٰ بن گئے جہاں وہ کچھ زیادہ مقبول نہ تھے۔ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی سے ہوئے معاہدہ کے تحت 3 سال بعد مفتی محمد سعید نے یہ عہدہ ان کے حوالے کر دیا۔ آزاد نے 2008 میں امرناتھ کی متنازع زمین اور پی ڈی پی کی حمایت واپس لینے کے بعد اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

سونیا کی صدارت کے زمانہ میں کانگریس نے ایک بڑا انقلابی قدم عورتوں کو پارٹی کی تنظیم

میں ہر سطح پر 33 فیصدی نشستوں کے ریزرویشن کی شکل میں اٹھایا اوراس مقصد کے لئے سونیا نے کانگریس کے دستور میں بھی اہم تبدیلیاں کیں۔ جب لوک سبھا میں خواتین کی نشستوں کا بل پیش کیا گیا تو کانگریس نے سب سے بڑھ کراس کی تائید کی مگراس مسئلہ میں ایسی گتھیاں تھیں کہ ابھی تک وہ بل قانون کی شکل اختیار نہیں کر پایا۔ پھر بھی اس معاملہ نے سونیا کی نیک نامی میں اضافہ کیا۔ کانگریس نے ایک اوراہم فیصلہ 10 جون 2001 کو یہ کیا کہ وہ تمام عطیہ جات صرف چیک کی شکل میں قبول کرے گی۔ ورکنگ کمیٹی کے کچھ ممبروں نے اس طریقہ کی عملی دقتوں کو بیان کیا مگر سونیا نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ انھوں نے کہا کہ پارٹی کو مالی امداد دینے کے طریقے صاف ستھرے اور ہر ایک کے علم میں آنے والے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ان کے ان خیالات کی تائید رتن ٹاٹا اور بہت سے صنعت کاروں نے کی۔

بہر حال یہ صحیح ہے کہ شروع میں سونیا اپنے آپ کو غیر سیاسی اور لوگوں سے الگ تھلگ رکھنا چاہتی تھیں، خاص کر وہ میڈیا سے دور رہنا چاہتی تھیں اور بہت دنوں تک ان کا یہ خیال رہا کہ میڈیا کا رویہ ان کے ساتھ مخاصمانہ ہے۔ اس لئے وہ انٹرویو دینے سے برابر انکار کرتی رہیں۔ انھوں نے ہندی روزنامہ پنجاب کیسری اور ٹائمز آف انڈیا کو تو انٹرویو دینا منظور کیا مگر دہلی میں کام کررہے اطالوی میڈیا کو یہ کہہ کرٹال دیا کہ وہ اجیت جوگی اوروی این گاڈگل سے رابطہ کریں۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ شاردا پرشاد یا سُمن دوبے جیسے باصلاحیت فرد کو اپنا میڈیا ایڈوائزر یا مشیر بنالیں مگر انھیں کوئی شخص مرضی کے مطابق نہیں ملا اورانھیں مجبوراً یہ ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔

انھیں میڈیا کا ایک تلخ تجربہ 1998 میں ہوا جب انھوں نے میڈیا کے ان تمام نمائندوں سے ان کی لیاقت، تجربہ، خانگی حالات کی تفصیل انٹرویو دینے سے قبل مانگی جو کانگریس پارٹی اور اس کے لیڈروں کے متعلق خبریں فراہم کیا کرتے تھے۔ مگر ان کی اس اُپج کو کسی نے اہمیت نہیں دی۔

اپنی سیاسی تعلیم وتربیت کے بارے میں سونیا نے جون 2007 میں نیکس انسٹی ٹیوٹ

تلبرگ (ہالینڈ) میں ''جیتی جاگتی سیاست، ہندوستان نے مجھے کیا سکھایا'' کے عنوان پر ایک دلچسپ اور پُر مغز تقریر کی۔ انھوں نے کہا'' راجیو گاندھی سے شادی کے بعد میں نے نہرو گاندھی گھرانے میں سیاست کے ابتدائی سبق سیکھے اور 1997 میں رسمی طور پر سیاست میں داخل ہوئی۔ مجھے دو باتیں اہم اور یادگار نظر آئیں۔ ایک تو 1971 کے بحران میں اندرا گاندھی کا تدبّر اور دوسرے ان کا وہ عزم اور جوش وخروش جس سے انھوں نے ملک کی قحط سالی اور بیرونی امداد کی محتاجی کا مقابلہ کیا''۔

اپنی اس تقریر میں انھوں نے ہالینڈ کے دو نامور مصوروں وین گاگ اور ریمبراں کی ان دلآویز تصویروں کا ذکر کیا جن میں تاریکی اور روشنی، قسمت کے چھپے ہاتھ اور زندگی کے حقیقی مفہوم کی رنگ آمیزی فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے وطن اٹلی اور سسرال ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ کا ذکر کیا۔ اندرا جی کے نام ان کے والد جواہر لعل نہرو کے بہترین خطوط، ان کی مثالی تربیت اور جواہر لعل نہرو کی مفید کتابوں نے انھیں ہندوستان کی سچی زندگی سمجھنے کا موقعہ دیا اور ان کے شوہر نے اس مطالعہ میں ان کی بڑی رہنمائی کی۔ انھوں نے بحیثیت بہو اور پھر وزیر اعظم کی اہلیہ کی حیثیت سے جو عملی تجربے حاصل کیے ان کا ذکر کرتے ہوئے تقریر کے خاتمہ میں کہا'' مجھے اپنی گھریلو زندگی سے سیاسی اور انتظامی حقیقتوں کا علم ہوا اور جیسا نوبل خطاب یافتہ دانشور امرتیہ سین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی پبلک زندگی زبردست بحث ومباحثہ سے عبارت ہے اور سیاست ہماری جمہوریت کا سب سے دلکش تحفہ ہے''۔

کانگریس کی قیادت

دسمبر 1997 کا وہ تیسرا ہفتہ تھا جب سونیا گاندھی پہلی بار عملی سیاست میں حصہ لینے پر آمادہ ہوئیں اور اس خبر کو عام کرنے کے لئے انھوں نے مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ دگ وجے سنگھ عرف 'دگی بھیا' کو چنا۔ وہ سونیا سے کانگریس کے صدر سیتارام کیسری کی شکایت کرنے آئے تھے۔ ان کے اور بعض دوسرے پارٹی لیڈروں کے نزدیک کیسری پارٹی کے لئے سہارا نہیں بلکہ بوجھ تھے۔ سیدھے عوامی انتخاب سے ہمیشہ بچتے رہنے والے سیتارام کیسری میں کوئی خاص خوبی ایسی نہ تھی جس سے وہ مقبول یا ہردل عزیز کہے جاسکتے۔ البتہ وہ ایک سیدھے سادے گاندھی بھگت کے روپ میں جیتنے والے گروہ کا ساتھ دے کر اس بڑے عہدے پر کچھ جوڑتوڑ کر کے پہنچ گئے۔

دگ وجے سنگھ نے تفصیل سے سونیا گاندھی کو بتایا کہ کیسری کے صدر کانگریس ہونے کی وجہ سے جنوری 1998 کے ہونے والے الکشن میں کانگریس کو سوسیٹیں ملنا بھی مشکل ہوجائیں گی۔ سونیا نے یکا یک ان سے سوال کیا "اچھا اگر میں کانگریس کے لئے ووٹ مانگنے نکلوں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا"؟ سنگھ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا مگر وہ جھٹ سے بول اٹھے "میڈم! پھر تو ہم الکشن اکثریت سے جیت لیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے انھیں 1984 میں راجیو کا زمانہ یاد آگیا جب ان کو مدھیہ پردیش کانگریس کا صدر بنایا گیا اور تب ہی سے وہ نہرو گاندھی گھرانے کے پکے وفادار بن گئے۔

سونیا سے احمد پٹیل، کمل ناتھ، اشوک گہلوت اور بڑی تعداد میں کانگریسیوں نے درخواست

کی کہ وہ پارٹی کو ٹوٹنے اور کمزور ہونے سے بچائیں۔ اس کی تائید کرونا کرن، ارجن سنگھ، اے کے انٹونی، جتیندر پرشاد، گاڈگل اور سولنکی نے بھی مختلف انداز میں کی۔ راجیو گاندھی کے قتل کی تفتیش میں ٹال مٹول اور تاخیر کی بنا پر سونیا اور ان کے متعلقین سیاست میں آنے کی پہلے ہی سوچ رہے تھے، ارجن سنگھ، جتیندر پرشاد نے اسی حربے کو چابک دستی سے استعمال کیا اور سونیا کے اس نظریہ کی تائید کی کہ لبریشن ٹائیگرس تنہا ہی راجیو کے قتل کی ذمہ دار نہیں کہی جاسکتی اور اس کے ساتھ کچھ اور ادارے بھی اس سفاکانہ قتل میں شامل تھے۔ ان تمام باتوں سے سونیا یہ سوچنے پر مجبور ہوئیں کہ کہیں ان کی عدم دلچسپی سے کانگریس کا سیاسی سطح پر صفایا نہ ہوجائے، جس کی ذمہ دار وہ ٹھہرائی جائیں گی۔ چنانچہ اگلے 48 گھنٹوں میں انھوں نے راہل گاندھی اور پریئنکا سے مفصل بات چیت کی، آخر میں پریئنکا کے مشورہ پر کنبہ نے طے کیا کہ کرسمس کے آس پاس سونیا کانگریس کی طرف سے انتخابی دورے کرنے کا اعلان کردیں۔

جب امیتابھ بچن کو یہ خبر پہنچی تو انھوں نے سختی سے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ کانگریسی لیڈر اپنی ذاتی منفعت کے لئے ان کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ سونیا کو ان کی دلیل میں کچھ وزن تو محسوس ہوا مگر وہ اپنے ارادہ پر قائم رہیں۔

ادھر چاچا کیسری اپنے گرد حمایتیوں اور وفاداروں کی فوج اکٹھا کرنے میں لگے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بہت سے کانگریسی ان سے اس لئے ناراض ہیں کہ انھوں نے جین کمیشن کی آڑ میں دیوگوڑا اور گجرال کی سرکاروں کو گرادیا تھا اور انھیں یہ بھی خدشہ تھا کہ ارجن سنگھ اور جتیندر پرشاد نے ان کے خلاف سونیا کے خوب کان بھردئے ہیں۔ انھوں نے ان سے مل کر ان کا مزاج ٹٹولنا چاہا مگر ان کو کچھ پتا نہ چلا کہ میڈم کیا کرنے جارہی ہیں۔ حالانکہ جب کیسری سوشل ویلفیر کے وزیر تھے تو انھوں نے سونیا کو خوش رکھنے کے لئے یہ احکام جاری کردئے تھے کہ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کی تمام اسکیموں کو فی الفور منظوری دے دی جائے۔ ان کا کہنا تھا ''سرکاری پیسہ اگر اندرا کے خاندان کے پاس جارہا ہے تو اس میں کیا برائی ہے''۔

کیسری ایک تو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، پھر ذات پات کی تفریق اور جنوب وشمال مشرق کے لیڈروں سے ٹھیک سے بات چیت نہ کر سکنے کی مجبوریوں سے وہ یو پی، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان کی اونچی ذاتوں میں اچھی نظر سے نہ دیکھے جاتے تھے۔ پھر ان کے مخالفوں نے یہ پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا کہ وہ نہرو-گاندھی خاندان کے غلبہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور یہ زور وشور سے کہتے ہیں کہ ''راجاؤں مہاراجوں کا زمانہ لد گیا۔ بدیشیوں کو ملک چھوڑ دینا چاہئے۔ میں ہزاروں انگریزوں سے لڑ چکا ہوں اور معمولی اطالوی عورت کی میرے سامنے کیا حیثیت ہے''۔ کیسری یہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ وہ تحریک آزادی میں کئی دفعہ جیل جا چکے ہیں اور انھوں نے بہار میں لال پگڑی والوں کے ڈنڈے بھی خوب کھائے ہیں۔ اسی طرح وہ سبھاش چندر بوس کو نہرو سے زیادہ کامیاب لیڈر مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گاندھی جی نے بجائے بوس کے نہرو کو چن کر بڑی غلطی کی ورنہ آج دیش کا نقشہ بالکل دوسرا ہوتا۔ ایک عجیب نظریہ ان کا یہ بھی تھا کہ نہرو کی رہنمائی میں کانگریس نے بنگالی قیادت کو کبھی ابھرنے نہیں دیا۔ اور یہ رویہ سبھاش چندر بوس سے لے کر اب تک ممتا بنرجی کے ساتھ قائم ہے۔ لوگ حیرت سے کہتے تھے کہ آخر بوس کا ممتا بنرجی سے کیوں کر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

28/دسمبر 1997 کی سہ پہر کو 24/اکبر روڈ دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں سونیا نے اپنے سیاست میں آنے کا اعلان کیا۔ اس طرح کی پریس کانفرنسیں کانگریس کے صدر دفتر میں اکثر ہوتی رہتی تھیں اور اس مرتبہ کیسری کا ارادہ تھا کہ وہ صحافیوں سے غیر رسمی گفتگو کریں۔ چنانچہ وہ ڈھائی بجے وہاں پہنچ گئے مگر تھوڑی ہی دیر میں انھیں 10 جن پتھ سے ونسنٹ جارج کی ایک مختصر تحریر ملی کہ پریس کانفرنس میں سونیا اپنے سیاست میں آنے اور جنرل الکشن میں کانگریس کی طرف سے انتخابی دورے کرنے کا اعلان کریں گی۔ یہ رقعہ جب کیسری کو ملا تو وہ سٹ پٹا گئے اور ان کے مزاج کی شگفتگی جاتی رہی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اس رقعہ کو لانے والے ٹام وڈاکن کو چوکیدار

نے 24/اکبر روڈ میں اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ وڈاکن نے جب یہ دیکھا کہ چوکیدار ان کو اندر نہیں جانے دیتا ہے تو انھوں نے ایک صحافی ہریش کھرے کو جو کیسری سے ملنے جارہے تھے وہ پرچہ یہ کہہ کر دیا کہ اسے کیسری کو دے دیں۔ پرچہ کا مضمون پڑھ کر کیسری کا منہ اتر گیا اور انھوں نے ہریش کھرے سے کہا ''سب کچھ ختم ہو گیا، وہ آرہی ہیں''۔ اس وقت ان کو یاد نہیں رہا کہ وہ خود سونیا کو سیاست میں آنے کی دعوت اپنے متعدد بیانات میں دے چکے ہیں۔ ان کے قریبی حلقوں نے بتایا کہ وہ پہلے تو سونیا کو خوش آمدید کہنے پر تیار تھے مگر پھر یہ سوچ کر اپنی رائے بدل دی کہ ایک منتخب صدر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ سونیا کی ماتحتی میں کام کرے۔ انھیں ارجن سنگھ، کمل ناتھ وغیرہ کا بھی خیال آیا جو برابر سونیا کو ان سے بدظن کیا کرتے تھے۔ جب سونیا کو کیسری کے مخاصمانہ رویہ کی خبر پہنچی تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ انھیں اپنے کچھ مخلص دوستوں کا قول یاد آیا کہ کانگریس پارٹی میں بہت سے ناقابل اعتماد لوگ ہیں جو کسی بھی موقعہ پر ان کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ اگر چہ وہ اپنے فیصلہ پر قائم رہیں مگر انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''مجھے سیاست میں آنے کے فیصلے پر افسوس نہیں ہے مگر مجھے یہ دیکھ کر تکلیف ہوئی کہ جو لوگ مجھ سے اس فیصلہ کے لئے بار بار اصرار کیا کرتے تھے بعد میں انھوں نے مجھ پر بالکل بے بنیاد الزامات لگائے اور پارٹی چھوڑ کر چلے گئے''۔ ان کا اشارہ سنگما، طارق انور اور شرد پوار کی طرف تھا۔

سیاست میں قدم رکھنے کے بعد سونیا کو احمد پٹیل سے بڑی مدد اور تقویت ملی۔ انھوں نے ایک معتبر ایجنسی کی رپورٹ ان کے سامنے پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ سونیا کے اس قدم سے پارٹی کی طاقت اور سیکولر کردار میں بڑا اضافہ ہوگا اور لاکھوں کانگریسی کارکن ان کا ساتھ ہر موقع پر دیں گے۔ اس طرح سات سال کی کشاکش اور اندرونی کشمکش کے بعد سونیا نے انڈین نیشنل کانگریس کی 112 ویں برسی پر یہ تاریخی قدم اٹھایا۔ عام انتخاب کی تاریخوں کا اعلان ہو چکا تھا اور امیدواروں کا انتخاب کرنے کے لئے 3-4 جنوری کو کانگریس کی مرکزی ریاستی کمیٹیوں کا اجلاس سیتارام کیسری نے طلب کیا تھا مگر اب ان کی پوزیشن نمائشی ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ روزانہ جنرل سکریٹری

آسکر فرنانڈیز کے ذریعہ ونسنٹ جارج ممبروں کی فہرست کی فائل کیسری کے پاس منظوری کے لئے بھیجتے تھے جن کو الکشن میں ٹکٹ دیا جانا تھا۔ جب بھی کیسری سونیا سے ملنے جاتے تو وہ ان سے کہتے کہ پارٹی کا ٹکٹ مناسب لوگوں کو نہیں دیا جارہا ہے، مگر ہر دفعہ سونیا گاندھی ان سے کہتی تھیں کہ کیسری جی مہربانی کر کے ارجن سنگھ اور مادھوراؤ سے مشورہ کیجیے۔

نئے سال کی شروعات سونیا-کیسری کشیدگی سے ہوئی۔ 11 رجنوری 1998 کو سونیا نے سری پیرمبدور میں پہلی پبلک میٹنگ سے خطاب کیا۔ 10 جن پتھ پر امیدواروں کی درخواستوں کا ڈھیر لگنے لگا جس میں سونیا کو مختلف انتخابی حلقوں میں دورہ کی دعوت دی گئی۔ ان کی خدمات کانگریس کے روایتی ووٹ، مسلمانوں، دلتوں، غریبوں اور مزدوروں سے حاصل کرنے کے لئے ضروری تھیں۔ ادھر کیسری سے ملنے والوں کی تعداد برابر گھٹتی جارہی تھی۔ روز کیسری جی کی دل کی دھڑکنوں میں سونیا جی کی تقریروں سے اضافہ ہو جاتا تھا جن میں صاف طور پر کہا جاتا تھا کہ الکشن کے بعد سونیا عملی سیاست میں کھل کر حصہ لیں گی۔

تاریخ میں پہلی دفعہ صدر کانگریس کو الکشن کی مہم میں نظر انداز کیا گیا اور کسی ریاست سے کیسری جی کو الکشن پروپیگنڈوں کے لئے طلب نہیں کیا گیا۔ ایک دفعہ کیسری جی جالندھر کسی چناؤ جلسہ میں ہوائی جہاز سے جارہے تھے کہ ان کو دمہ کا دورہ پڑ گیا اور انھیں واپس لوٹنا پڑا۔

لیکن بارہویں لوک سبھا الکشن کا نتیجہ کانگریس کے لئے اچھا نہیں نکلا۔ حالانکہ سونیا نے 130 انتخابی جلسوں میں حصہ لیا تھا مگر کانگریس کو کل 142 نشستیں ہی مل پائیں۔ ارجن سنگھ اور نارائن دت تیواری نے جھٹ شکست کا ذمہ دار سیتارام کیسری کو ٹھہرایا۔ انھوں نے کہا کہ تنظیمی کمزوری کی وجہ سے کانگریس سونیا کی ہردل عزیزی کا فائدہ اٹھا نہ سکی۔ سونیا نے بھی اس سے اتفاق کیا مگر یہ کہا کہ اگر کیسری خود سے دست بردار ہو کر ان کو صدارت کی دعوت دیں تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مگر بھلا چاچا کیسری ایسا کب کرنے والے تھے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں نے صلاح کر کے احمد پٹیل اور غلام نبی آزاد کے سپرد یہ کام

کیا کہ وہ کیسری کو صدارت چھوڑنے پر آمادہ کریں۔ مگر کیسری جی نے ہنس کر ان سے کہا ''تم کو ارجن سنگھ اور جارج نے سکھا پڑھا کر بھیجا ہے۔ اگر سونیا جی کی یہی مرضی ہے تو وہ براہ راست مجھ سے کہیں''۔ شرد پوار، انٹونی، جتیندر پرشاد اور پرنب مکھر جی بھی کیسری کو ہٹانے کے حق میں تھے۔ شرد پوار فوری کارروائی چاہتے تھے مگر دوسرے کانگریسی لیڈر کیسری جی کو کچھ مہلت دینے پر آمادہ تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر کیسری کیمپ نے بھی جوابی حملے شروع کئے۔ سب سے پہلے تو کیسری کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے جلسے نہ بلائیں۔ کیسری جی کو یقین تھا کہ چونکہ وہ صدر منتخب کئے گئے ہیں اس لئے ان کو کوئی ہٹا ہی نہیں سکتا۔

ورکنگ کمیٹی کا جلسہ بالآخر 5/مارچ 1998 کو پارٹی کی شرمناک شکست کا جائزہ لینے کے لئے ہوا۔ اس جلسہ میں دو اہم فیصلے کئے گئے۔ سب سے پہلے سونیا سے درخواست کی گئی کہ وہ پارٹی کے کاموں میں اہم اور مؤثر کردار ادا کریں اور دوسری بات یہ کہ وہ پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کا معقول لیڈر چننے میں پارٹی کی مدد کریں۔ پچھلی لوک سبھا میں کیسری جی پارٹی کی لیڈر تھے۔ کیسری جی تشویش میں پڑ گئے۔ مگر انھیں اطمینان تھا کہ سونیا شرد پوار کو کسی حال میں پارلیمنٹری پارٹی کا لیڈر نہ بننے دیں گی۔ کانگریس کے دستور میں یہ ترمیم کی گئی کہ پارلیمنٹری بورڈ کی قیادت ایسا شخص بھی کر سکتا ہے جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے کسی کا بھی ممبر نہ ہو۔ اس طرح سونیا کے لیڈر ہونے کا راستہ صاف ہو گیا۔

پٹیل اور آزاد مشن کے ناکام ہونے کے بعد کیسری کو سمجھانے بجھانے کا کام ڈاکٹر منموہن سنگھ، پرنب مکھر جی اور اے کے انٹونی کو دیا گیا۔ ان تینوں نے کیسری کی خدمات کا اعتراف کیا مگر یہ کہا کہ پارٹی کے مفاد کا تقاضہ ہے کہ یہ عہدہ سونیا سنبھال لیں۔ اس کے جواب میں کیسری بس اتنا ہی کہہ سکے ''اگر آپ کے خیال میں میرا رہنا پارٹی کے مفاد میں نہیں تو میں ہٹنے پر تیار ہوں مگر اس سے پہلے میں میڈم (سونیا گاندھی) سے بات کرنا چاہوں گا''۔ اس طرح انھوں نے کچھ مہلت حاصل کر لی۔ اب انھوں نے ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی رائے ٹٹولنا شروع کی اور انھیں یہ

جان کر بڑی ناامیدی ہوئی کہ تقریباً سب ہی ممبران ان سے برگشتہ ہو چکے ہیں اور صرف طارق انور ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اب کیسری سونیا جی سے ملنے گئے اور ان سے کہا کہ وہ پارٹی کی صدارت چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کی گھبراہٹ کی کوئی حد نہ رہی جب آہستہ سے سونیا نے ان سے پوچھا ''آپ ایسا کب کریں گے''؟ بزرگ لیڈر کی حرماں نصیبی اور مایوسی دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کو اندرا جی نے کانگریس کا خزانچی بنایا تھا جس کے بعد وہ ترقی کر کے صدر بن گئے تھے۔ بہر حال انھوں نے سونیا سے کہا کہ وہ جلد ہی پریس کانفرنس بلا کر اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیں گے۔ 9/ مارچ 1998 کو کیسری نے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا، مگر منٹوں ہی میں وہ اپنے اس فیصلے سے پھر گئے۔ انھوں نے کہا کہ پریس کے سامنے انھوں نے صرف اپنے استعفیٰ دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، مگر سب اخباروں نے جلی الفاظ میں ان کے استعفیٰ کی خبر چھاپ دی۔ کیسری نے پھر یہ کہا کہ وہ اپنا استعفیٰ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ عام میں پیش کریں گے اور جن نمائندوں نے انھیں صدر کانگریس چنا تھا ان کی منظوری لینے کے بعد ہی عہدہ چھوڑیں گے۔ مگر ان کے اس بیان کو کسی نے اہمیت نہیں دی۔ پھر بھی چاچا یہی راگ الاپتے رہے کہ لیڈر شپ کا معاملہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہی طے کرے گی۔ سونیا نے ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے صورت حال کی واقفیت حاصل کی اور خاموش رہیں۔

پرنب مکھرجی، منموہن سنگھ اور انٹونی کیسری سے پھر ملے۔ اس دفعہ ان کا پارہ چڑھا ہوا تھا، انھوں نے گرم ہو کر کہا ''میں استعفیٰ دے چکا ہوں اور جب میرا جی چاہے گا ورکنگ کمیٹی کا جلسہ طلب کروں گا''۔

جارج اور جتیندر پرشاد نے آپس میں صلاح کر کے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو 14/ مارچ کو دوپہر کے کھانے پر بلایا، جس میں اڑیسہ اور میزورم کے وزرائے اعلیٰ کو چھوڑ کر سب ہی ممبران نے شرکت کی۔ اس کے بعد پرنب مکھرجی نے کانگریس کے دستور سے ایک شق ایسی

ڈھونڈ نکالی جس کے تحت کانگریس ورکنگ کمیٹی بہت ہی خاص حالات میں سخت کاروائی کر سکتی ہے۔ چنانچہ تیرہ ممبران ورکنگ کمیٹی نے ایک تیز و تند ریزولوشن کیسری جی کے پاس بھیجا کہ وہ فوراً ورکنگ کمیٹی کا جلسہ طلب کریں تاکہ ان کے استعفیٰ دینے سے جو غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے وہ ختم ہو سکے۔

جب ورکنگ کمیٹی کا جلسہ شروع ہوا تو کیسری جی نے اس کے ایجنڈہ پر اعتراض کر کے 8 منٹ کے اندر جلسہ ختم کر دیا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ حالانکہ پرنب مکھر جی نے ان کی خدمات کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ یہ تجویز پیش کی تھی کہ سونیا گاندھی سے صدارت قبول کرنے کی درخواست کی جائے۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ اور مکھر جی کی پیہم درخواستوں کا کیسری پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر جتیندر پرشاد نائب صدر نے کرسی صدارت سنبھالی اور پرنب مکھر جی کا ریزولوشن منظور کر لیا گیا۔ صرف طارق انور نے مخالفت کی اور کمیٹی کی غیر آئینی اور ناجائز کاروائی کے خلاف بطور احتجاج واک آوٹ کر گئے۔ ورکنگ کمیٹی کے بقیہ ممبر سب کے سب 10 جن پتھ سونیا گاندھی کے پاس جا پہنچے اور دوپہر کو صدارت کی کرسی سونیا گاندھی کو دے دی گئی۔ کیسری کے نام کی تختی دفتر سے ہٹا کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دی گئی اور اس کی جگہ سونیا کا نام جلی الفاظ میں لکھ دیا گیا۔

ساڑھے پانچ بجے شام کو سونیا اکبر روڈ آئیں اور ورکنگ کمیٹی کے جلسہ کی صدارت کی۔ اس کے بعد وہ کیسری سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئیں اور انھیں عظیم لیڈر کا خطاب دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے مقرر کردہ عہدے داروں کو ہٹایا نہیں جائے گا۔ کیسری نے بعد میں اپنے شش و پنج کا اظہار ان الفاظ میں کیا ''یہ ان کی مہربانی تھی کہ مجھ سے ملنے تشریف لائیں۔ اب میں ان کو دوسروں کی بدعہدی کے بارے میں کیا بتاتا۔ وہ میری مہربان تھیں''۔

اس کے بعد کیسری جی نے ممتا بنرجی سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی مگر اس میں کوئی کامیابی نہ ہوتے دیکھ کر وہ ورون اور مینکا گاندھی کی طرف مائل ہوئے تاکہ سونیا، راہل اور پریانکا کے خلاف

سیاسی مہم چھیڑی جا سکے۔ مگر ابھی یہ سب کوششیں نیم پختہ حالت میں تھیں کہ وہ اچانک غسل خانے میں گر پڑے اور انھیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں ان پر دمہ کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں بہت سے راز اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے وہ اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔

باغیوں سے مقابلہ

15 مئی 1999 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں ہر ایک کو عجلت تھی کہ گوا اسمبلی کے الکشن لڑنے والے امیدواروں کی فہرست بنالی جائے انتخابات میں دوسری پارٹیوں کی مرضی کے موافق شرائط پر اتحاد ہو جائے اور اسی کے ساتھ راجیو گاندھی کے قتل اور اس کی تفتیش پر بحث مباحثہ بھی ہو جائے تاکہ کرکٹ کے شائقین انگلینڈ میں ہونے والے کرکٹ ورلڈ کپ کے پہلے میچ میں ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے درمیان دلچسپ میچ کا لطف اٹھا سکیں۔

ایسے ماحول میں صاف شفاف سفید کپڑوں میں ملبوس مسکراتے ہوئے شرد پوار نے پی اے سنگما کے ساتھ مل کر کانگریس میں علم بغاوت بلند کیا اور چھوٹے قد کے زبان چلانے والے سنگما نے بھارتیہ جنتا پارٹی کی سونیا کے غیر ملکی ہونے کے خلاف چھیڑی ہوئی مہم کی پرزور حمایت کرتے ہوئے سونیا گاندھی اور ان کے بہی خواہوں کو سکتہ میں ڈال دیا۔ سنگما نے بلاکسی رورعایت کے سونیا کو بتایا کہ ہندوستانی عوام ان کے گھر والوں اور ان کے حالات بہت کم جانتے ہیں اور ملک کو ان کے غیر ملکی ہونے سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ ان دونوں باغیوں کے ساتھ سیتارام کیسری کے چہیتے طارق انور بھی شامل ہو گئے جن کو سونیا نے ورکنگ کمیٹی میں برقرار رکھا تھا۔ پوار نے سنگما کے حملہ کو آگے بڑھاتے ہوئے سونیا کو یاد دلایا کہ بی جے پی کے لگائے ہوئے الزام کے جواب میں کانگریس اپنی صدر کی شہریت اور ملک سے مشکوک وفاداری کے متعلق خاطر خواہ جواب نہیں دے پا رہی ہے اور یہ ایک بڑا سنگین معاملہ ہے۔

آر بیسنو کی خاتون کی حالت دس سال پہلے اپنے شوہر کے بوفورس سودے میں پھنسنے اور اپنی ساس کی 1969 اور 1977 کی پریشانیوں سے کہیں بڑھ کر نازک اور دشوار تھی۔ ایک دم ان کو احساس ہوا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہیں۔ سنگما نے طعن وطنز کے تیکھے تیر برساتے ہوئے کہا کہ جب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا کروڑوں ہندوستانیوں میں سے ایک مناسب شخص بھی کانگریس کو وزیراعظم بنانے کے لئے نہیں مل رہا ہے تو بدقسمتی سے ہم اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ اب سونیا کو محسوس ہوا کہ کانگریس کے لیڈروں کے بارے میں امیتابھ بچن نے ان کو صحیح آگاہی دی تھی۔ پوار اور سنگما کی تقریروں میں ایک حد تک راجیش پائلٹ نے واقعیت کی جھلک دیکھی مگر ان کا ساتھ نہیں دیا۔ آر کے دھون نے پوار اور سنگما پر الزام لگایا کہ وہ بی جے پی اور آر ایس ایس کی باتوں پر یقین کر رہے ہیں۔ اسی وقت سونیا گاندھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور کمرہ سے باہر جانے لگیں۔ جس سے احمد پٹیل، محسنہ قدوائی، کرونا کرن، وجے بھاسکر ریڈی وغیرہ پریشان ہو گئے اور ارجن سنگھ ان کے پیچھے ننگے پیر ہاتھ جوڑے ہوئے لپکے۔ انھوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا البتہ اپنے جڑے ہاتھوں سے سونیا پر ظاہر کیا کہ پارٹی کے لوگ ان سے کیا چاہتے ہیں اور یہ کہ اگر وہ الگ ہٹ گئیں تو قومی سیاست کو بڑا دھچکا لگے گا۔

ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر کو 1977 کا وہ واقعہ یاد آیا جب ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسہ میں جگجیون رام نے اندرا جی کی قیادت کو چیلنج کیا تھا۔ انھوں نے کہا سونیا چونکہ اندرا جی کو اپنا مثالی قائد سمجھتی ہیں اس لئے ان کو اپنے مخالفین سے مقابلہ کر کے ان ہی کی طرح اپنی فوقیت دکھانا ہوگی۔ اس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے کچھ اور ممبروں نے بھی سونیا سے اندرا جی کی طرح ان لوگوں کے مقابلہ کا مشورہ دیا تو انھوں نے جواب میں کہا ''مگر میں بدقسمتی سے جواہر لال نہرو کی بیٹی نہیں ہوں''۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب بی جے پی نے ان کے غیر ملکی ہونے کا شوشہ چھوڑا تھا تو سونیا جی نے اس کے مقابلہ کا عزم ظاہر کیا تھا۔

بہر حال سونیا کے جانے کے بعد ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ختم ہو گیا مگر اس کے پہلے ارجن سنگھ

نے اس مہم کے خلاف ایک تیز و تند ریزولوشن پیش کیا جس کی حمایت کرتے ہوئے دھون نے کہا ''اس لڑائی میں میڈم اکیلی نہیں ہیں ہم سب ان کے ساتھ ہیں''۔ مگر اس کا پوار اور سنگما پر کوئی اثر نہ ہوا اور انھوں نے جانے کے قبل پرنب مکرجی سے کہا کہ ان کے لئے یہ ورکنگ کمیٹی کا آخری جلسہ ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد جب سونیا اور پرنب مکرجی اور سندھیا وغیرہ گوا کے الکشن میں لڑنے والوں کی فہرست تیار کر رہے تھے، تینوں باغیوں کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جسے سونیا کے خلاف فرد جرم سمجھنا چاہیے۔ سونیا نے اس خط کو پڑھا تک نہیں مگر ونسنٹ جارج نے ارجن سنگھ، پرنب مکرجی اور ڈاکٹر من موہن سنگھ سے درخواست کی کہ وہ اس کا معقول جواب تیار کریں۔

ارجن سنگھ نے فوراً مورچہ کی کمان سنبھالی اور پوار، سنگما اور انور کو موجودہ دور کے میر جعفر کا لقب دے دیا کیونکہ انھوں نے پارٹی سے غداری کی ہے۔ انھوں نے پوار پر الزام لگایا کہ اپنی عادت کے مطابق انھوں نے سونیا کو نشانہ بنایا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ارجن سنگھ ہی 1985 میں پوار کو کانگریس میں لائے تھے حالانکہ راجیو کی کچھ زیادہ مرضی نہ تھی۔ پوار کے مخالفین نے ان کو یاد دلایا کہ راجیو کے انتقال کے بعد وہ ان لوگوں میں آگے آگے تھے جنھوں نے سونیا سے کانگریس پارٹی کا چارج لینے کی درخواست کی تھی اور جسے انھوں نے مسترد کر دیا تھا۔ پھر سیتارام کیسری کو ہٹا کر ان کی جگہ سونیا کو لانے میں ان کا خاص حصہ رہا تھا۔

اس بغاوت سے کچھ ہی روز پہلے واجپئی سرکار گرنے کے بعد پوار کو یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ وہ کانگریس کا ساتھ دینے والی جماعتوں اور ریاستی لیڈروں کو ترغیب دلائیں کہ ملک کی اگلی وزیر اعظم سونیا جی بنائی جائیں۔ اور اسی مقصد کے لئے وہ مدراس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ سے ایک روز پہلے اے آئی اے ڈی ایم کے پارٹی کی قائد جے للتا سے ملنے گئے تھے۔

پھر بھی بہتوں کا خیال تھا کہ بغاوت کی تیاری کئی مہینوں سے کی جا رہی تھی اور پوار اور سونیا گاندھی کے درمیان شگفتہ تعلقات نہیں تھے۔ سونیا راجیو گاندھی کے اس مقولہ کے مطابق پوار سے

دور رہنا چاہتی تھیں کہ پوار اچھے لیڈر بلاشبہ ہیں مگران پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ پوار کے لئے کسی کی حمایت کرتے کرتے اس کی مخالفت کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ چنانچہ 1978 میں وسنت دادا پاٹل کی مہاراشٹر میں کانگریس حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد میں پہلے تو انھوں نے تحریک کے خلاف ووٹ دیا۔ پھر اس کے بعد گورنر سے مل کر حکومت کی تائید واپس لے لی جس کی وجہ سے پاٹل کو ہٹنا پڑا۔

پہلے پوار اپنے بھروسہ کے لوگوں سے ارجن سنگھ کی ہجو کیا کرتے تھے مگر واقعہ یہ تھا کہ ان کو سب سے بڑا خطرہ سونیا سے تھا کہ اگر وہ اقتدار میں آگئیں تو پھر ان کی دال گلنا مشکل ہوگی اور وہ کبھی بھی وزیراعظم نہ بن پائیں گے۔ پوار کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر تیرھویں لوک سبھا میں کسی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہوئی تو وہ سونیا کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا سب سے اچھا موقع ہوگا۔ سابق وزیراعظم چندر شیکھر سماج وادی لیڈر ملائم سنگھ یادو اور سمتا پارٹی کے لیڈر جارج فرنانڈیز ان کی وزارت عظمٰی کی تائید کر چکے تھے۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ مایاوتی، چندرابابو نائیڈو، ممتا بنرجی، جے للتا اور دوسرے علاقائی لیڈر سونیا کے وزیراعظم بننے کو ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ ان حالات میں پوار کو یقین تھا کہ وہ متحدہ محاذ حکومت کے وزیراعظم آسانی سے بن جائیں گے۔ مگر 1999 کے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کے ساتھیوں کا پلّہ بھاری رہا اور اس سے بڑھ کر دھچکا پوار کو مہاراشٹر اسمبلی الکشن میں پہنچا جہاں ان کی پارٹی کانگریس سے کم نشستیں حاصل کر پائی۔

ورکنگ کمیٹی کے جلسہ کے بعد سونیا نے گھر پہنچ کر پرینکا اور راہل سے مشورہ کیا۔ دونوں اس صورت حال پر بڑے خشم ناک ہوئے۔ راہل نے سونیا کو سیاست فوراً چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ پھر پرینکا نے راہل سے مشورہ کر کے اس مضمون کا ایک خط پرنب مکرجی جنرل سکریٹری کانگریس کے نام تیار کیا۔ 16 مئی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک ہنگامی جلسہ باغیوں کے خط پر غور اور کاروائی کے لئے 4 بجے شام کو طلب کیا گیا۔ جلسہ میں سنجیدہ صورت بنائے سونیا آئیں تو

مگر ذرا دیر کے بعد یہ کہہ کر چلی گئیں کہ ان کا جلسہ میں شریک ہونا مناسب نہیں کیونکہ ان کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

اسی اثنا میں ونسنٹ جارج نے کمیٹی کے سامنے سونیا کے استعفیٰ کا خط پیش کیا جو 15 مئی کا لکھا ہوا تھا۔ خط کا مختصر متن یہ تھا۔

''آج صبح کے جلسہ میں میرے ساتھیوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ میرے غیر ملکی ہونے کا برا اثر پارٹی اور ملک پر پڑ رہا ہے اس لئے انھیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس سے مجھے تکلیف پہنچی اور ان حالات کی وجہ سے میں مجبوراً کانگریس پارٹی کی صدارت سے استعفیٰ دیتی ہوں۔ میں ایک غیر ملک میں پیدا ضرور ہوئی مگر میں ایک سچی اور محب وطن ہندوستانی ہوں اور آخر دم تک میں اپنے چُنے ہوئے ملک کی وفادار رہوں گی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ صرف کانگریس ہی ملک کو ایک مضبوط، سیکولر اور آزاد فلاحی حکومت دے سکتی ہے۔ میں پارٹی میں کسی ذاتی منفعت یا غرض سے شامل نہیں ہوئی۔ مجھے عام ہندوستانیوں اور کانگریسیوں نے عزت اور محبت سے نوازا ہے اس لئے میں صدارت سے ہٹنے کے بعد بھی پارٹی اور ملک کی خدمت اپنی صلاحیت بھر کرتی رہوں گی۔''

سونیا گاندھی

مگر ورکنگ کمیٹی نے ان کے استعفیٰ کو منظور نہیں کیا اور اس کے ممبروں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس فیصلہ کو واپس لے لیں۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ ان کو اپنے اوپر لگائے ہوئے الزام (غیر ملکی ہونے) سے سخت صدمہ پہنچا ہے اور اس سے بھی تکلیف ہوئی کہ جلسہ کے ممبرون نے خاموشی سے اس کو بغیر کسی احتجاج یا تردید کے خاموشی سے سن لیا۔ ان کے قریبی حلقوں کا بیان ہے کہ وہ پہلے ہی سے ملک کے عیسائیوں پر زیادتیوں اور بے جی پی کے ذاتی حملوں سے پریشان تھیں مگر انھیں بھروسہ اور امید تھی کہ کانگریس پارٹی ان کا ہمیشہ ساتھ دے گی۔ ان حالات میں خود کانگریسیوں کی الزام تراشی نے ان کا دل توڑ دیا۔ پوار کی بغاوت نے کانگریس میں

زبردست بحران پیدا کردیا۔ سونیا استعفیٰ واپس لینے پر تیار نہیں تھیں۔ ملک میں الکشن ہونے والے تھے اور ان کی جگہ لینے والا کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو پارٹی کو کامیابی سے ہم کنار کرا سکے۔

یوں تو پارٹی باغیوں کو نکال سکتی تھی یا ان کے لگائے الزام کو مسترد کر کے ان سے کہہ سکتی تھی کہ وہ اپنے خط کو واپس لیں یا سونیا اپنی خوشی سے کسی پبلک عہدہ کو قبول نہ کرنے کا اعلان کردیں مگر یہ سب کاغذی باتیں اور نظریاتی قیاسات تھے۔ ورکنگ کمیٹی نے ان تینوں باغیوں کو کانگریس سے خارج کردیا اور چھ سال تک ان کی ابتدائی ممبرشپ پر روک لگادی۔ اس فیصلہ پر صرف ایک ممبر نے یہ تکنیکی اعتراض کیا کہ سزا دینے سے قبل باغیوں کو وجہ بتاؤ نوٹس جاری نہیں کیا گیا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پہلے ان کو عارضی طور پر ممبرشپ سے معطل کرنا چاہیے تھا۔ انٹونی کے اس اختلاف کو سونیا کے طرف داروں نے قبول نہیں کیا مگر ان کے سینئر ہونے اور ایمانداری کی بنا پر اس کا برا بھی نہیں مانا۔ بعد میں سیتارام کیسری جتندر پرشاد اور راجیش پائلٹ نے بھی باغیوں کے ساتھ نرمی کے برتاؤ کا مشورہ دیا۔

ادھر کانگریس ہیڈ کوارٹر میں ڈرامائی واقعات ہوئے۔ ایک مشتعل مجمع نے سیتارام کیسری کو گھیر لیا اور دھکم دھکا میں ان کے کپڑے پھٹ گئے۔ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں مہمان خصوصی کے طور پر آئے تھے مگر جوش میں بھرے لوگوں نے ان پر باغیوں کا ساتھ دینے کا الزام لگایا۔ سونیا نے کیسری سے کانگریسیوں کی اس حرکت کی معافی مانگی۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بات چیت کے ذریعہ باغیوں سے نپٹنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ پرنب مکرجی، ارجن سنگھ اور ریڈی سخت کارروائی کے حق میں تھے مگر احمد پٹیل، انٹونی، راجیش پائلٹ چاہتے تھے کہ ضابطوں پر عمل کیا جائے اور کارروائی سے قبل ان کو صفائی کا موقعہ دیا جائے جب ورکنگ کمیٹی کی استدعا پر سونیا نے اپنا استعفیٰ واپس نہیں لیا تو یہ طے پایا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس بلا کر سونیا پر دباؤ ڈالا جائے۔ اکبر روڈ پر کانگریسیوں کا جم غفیر روز اکٹھا ہو کر ''سونیا لاؤ ملک بچاؤ'' کے نعرے لگاتا تھا۔ کانگریس ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ نے سونیا سے مل کر ان سے اپیل کی کہ وہ اپنا عہدہ نہ

چھوڑیں۔ پھر دگ وجے سنگھ نے ان سے یہ کہا کہ اگر وہ نہ مانیں گی تو تمام وزرائے اعلیٰ اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیں گے۔ یہی موقف ریاستوں کے کانگریسی عہدہ داروں نے بھی دہرایا۔ عورتوں اور اقلیتوں کے گروہ بھی جوق در جوق سونیا سے ملنے آتے تھے اور یہی مطالبہ کرتے تھے۔ 10 جن پتھ روڈ پر کئی دن تک غضب کا ہجوم رہا۔

لوگ دھرنے پر بیٹھے تھے اور جھنڈے لئے ہوئے نعرے لگا رہے تھے اور سونیا کی واپسی کے لئے تقریریں کر رہے تھے۔ سونیا کے حق میں اتنے بڑے عظیم مظاہروں سے ان کے مخالف سراسیمہ ہوگئے۔ جو کانگریسی باغیوں کے لئے نرم رویہ رکھتے تھے ان کا بھی انداز بدل گیا۔ پوار کے بہت سے حامی ان سے الگ ہونے لگے۔ پرینکا اور راہل نے بھی ان بدلے ہوئے حالات میں سونیا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دیں۔ سونیا کے وفاداروں نے ان کو یقین دلایا کہ سونیا کے صدر نہ رہنے سے پوار کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملے گا۔ پہلے سونیا گاندھی گوا کے انتخابی دورہ پر جانے کو تیار ہوئیں۔ پھر فتح مند پرنب مکرجی نے ایک پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ سونیا گاندھی نے اپنے استعفیٰ کا فیصلہ واپس لے لیا ہے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ہنگامی اجلاس کی صدارت بھی کریں گی۔ اس طرح یہ قضیہ نامرضیہ ختم ہوا اور پارٹی کو ایک بڑے بحران سے نجات مل گئی۔ بی جے پی اور پوار نے اس کو ایک سوانگ یا ناٹک قرار دیا جس کا مقصد لوگوں کی توجہ کو بنیادی مسائل سے ہٹانا تھا۔ اب سونیا گاندھی نے بھی اپنے مخالفوں پر پرجوش حملے کرنا شروع کردئے۔ انھوں نے صراحت کے ساتھ کہا کہ وہ عوام کی مرضی کے مطابق وزیراعظم کی دوڑ میں حصہ لیں گی اور یہ کہ ہندوستانی عوام ان کی حب الوطنی اور وفاداری کو ثابت کریں گے۔ ان کے الفاظ یہ تھے ''میری ہندوستانیت پر شک کرنے والوں کو میں جواب نہیں دوں گی۔ اس دیس کی جنتا دے گی۔ منہ توڑ جواب دے گی''۔ ایک تقریر میں انھوں نے کانگریس کے مندوبین سے کہا ''یہ دیس میرے جیون کے پل پل میں شامل رہا ہے۔ میں یہاں سہاگن بنی، میں آپ کی آنکھوں کے سامنے بیوہ ہوئی۔ اس دیس کی سب سے مہان پتری (عظیم دختر) نے اپنی سانس میری

بانہوں میں توڑی'' ۔ یہ تقریر سن کر مندو بین رو پڑے۔ سونیا نے ان کو یاد دلایا کہ اب پوار اور ان کے ساتھی بی جے پی کے ساتھ مل کر ان کو غیر ملکی ٹھہرا رہے ہیں حالانکہ اس سے پہلے وہ میرے پیچھے پڑے تھے کہ میں کانگریس کی قیادت سنبھال لوں۔ اب یہ لوگ میرے دشمنوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ میں پارٹی میں اس لئے واپس آئی ہوں کہ پارٹی قائم رہے اور ملک فرقہ وارانہ تعصب کے چنگل میں نہ آنے پائے۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی اور آپ کے تعاون سے اسی نئے دور کو شروع کروں گی۔'' سونیا کی اس تقریر کے بعد تال کٹورہ اسٹیڈیم ''سونیا کانگریس ہے اور کانگریس سونیا ہے'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔

اس واقعہ سے کانگریس چاہے اتنی مضبوط نہ ہوئی ہو مگر سونیا کی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ کانگریس کے لئے ان کی اہمیت بے انتہا بڑھ گئی۔ جیسے ہی سونیا گاندھی تال کٹورہ اسٹیڈیم پہنچیں ان کا زبردست خیر مقدم 'سونیا نہیں تو سشن نہیں'، 'بغیر سونیا کے کانگریس چل نہیں سکتی' کے پرزور نعروں سے کیا گیا۔ اس ماحول میں انھوں نے ایک استاد کی طرح سامعین کو ان الفاظ میں تنبیہ کی'' جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ ان کو جی جان سے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اور جن کو ذرا بھی شبہ یا تامل ہو وہ اپنا راستہ چننے کے لئے بالکل آزاد ہیں۔ مجھے ایسی کانگریس چاہئے جو ہر قیمت پر میرے ساتھ چلے اور اُن اصولوں کی خاطر خود کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جن پر چلنے کا میں نے فیصلہ کیا ہے''۔

اس طرح انھوں نے اپنی محترم ساس کی طرح دوٹوک لہجہ میں اپنا فیصلہ سنا دیا جس کو پارٹی نے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔

اس اجلاس کے بعد نئے کانگریس دربار میں منافقوں یا مشکوک لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ سونیا ایک طاقتور حکمران کی طرح پارٹی پر حاوی ہو گئیں۔ پارٹی کے لیڈران کی قیادت میں پوری وفاداری کے ساتھ صف آرا ہو گئے، کیونکہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ وہی انھیں دوبارہ اقتدار دلا سکتی ہیں۔

2004 کے عام انتخابات اور سونیا گاندھی

2004 کے عمومی انتخابات کی تاریخوں کا اعلان مدھیہ پردیش راجستھان اور چھتیس گڑھ کی ریاستی اسمبلیوں میں کانگریس کی زبردست شکست کے تین ماہ بعد کیا گیا اور یہ سونیا کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ کانگریس پارٹی مختلف وجوہ سے الکشن کے لئے پورے طور پر تیار نہیں تھی۔ ایک یہ کہ 1998 میں جب سونیا نے پہلی بار کانگریس کی قیادت سنبھالی تھی اس کے بعد پہلی مرتبہ کانگریسیوں کو ان کی قائدانہ صلاحیت پر شک ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف اٹل بہاری واجپئی کی مقبولیت پورے ملک میں بڑھ چلی تھی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی بڑی ہوشیاری سے مسلمانوں کو کانگریس سے ورغلا رہی تھی اور بدظن کر رہی تھی۔ سید احمد بخاری امام جامع مسجد دہلی اس کی حمایت میں سرگرم تھے پھر خود کانگریس پارٹی بھی اندرونی اختلاف اور تفرقوں کا شکار ہو رہی تھی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی حلیف پارٹیوں نے بڑے طمطراق سے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ واجپئی کے دور میں ہندوستان نے عالمی سطح پر زبردست ترقی کی اور ہر طرف ہندوستان کا نام چمک رہا ہے۔ چنانچہ میڈیا، ٹیلی ویژن، اشتہاروں اور پوسٹروں میں اس کا زور و شور سے پروپیگنڈا کیا گیا کہ ہندوستان پاکستان کے تعلقات اس زمانہ میں خوشگوار ہو گئے، ملک کی معیشت خوشحالی کی سطح پر پہنچ گئی اور بڑے زبردست تعمیری پروجیکٹ مثلاً ملک کے طول وعرض میں شاہراہوں کے زبردست پراجیکٹ کی شروعات ہوئی۔ ووٹروں سے اپیل کی گئی کہ وہ نیشنل

ڈیموکریٹک الائنس کو ایک موقعہ اور دیں تا کہ ہندوستان سپر پاور بن سکے۔ واجپئی کو این ڈی اے مورچہ کی کمان سونپی گئی اور ایل کے ایڈوانی نے ملک گیر یاترا کی مہم ووٹ حاصل کرنے کے لئے شروع کر دی۔ سونیا کو ان نا مساعد حالات کا احساس تھا خاص کر ان پیشن گوئیوں کا کہ اس دفعہ کانگریس کو پچھلی دفعہ سے بھی کم نشستین لوک سبھا میں ملیں گی۔ مگر وہ نا امیدی یا گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوئیں۔ انھوں نے کانگریسی لیڈروں کو منع کیا کہ وہ انھیں وزیر اعظم کی حیثیت سے پیش نہ کریں۔ مگر اس اقدام کو کچھ سیاسی مبصرین نے جن میں انڈین اکسپریس کے چیف ایڈیٹر شیکھر گپتا پیش پیش تھے غیر دانش مندانہ قرار دیا۔ انھوں نے لکھا کہ واجپئی کے مقابلہ میں کسی متعین کانگریسی امیدوار کا نام نہ لئے جانے سے بھارتیہ جنتا پارٹی کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔

مگر سونیا نے اپنی اس حکمت عملی سے شرد پوار، کرونا ندھی، لالو پرشاد یادو اور کئی لیڈروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ کانگریس نے ایک آواز ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ چودھویں لوک سبھا کے منتخب شدہ ارکان وزیر اعظم کا انتخاب خود ہی کریں گے۔ سونیا کی چناؤ مہم میں بھارتیہ جنتا پارٹی جیسا تام جھام تو نہ تھا مگر سونیا گاندھی نے ہفتہ کے ساتوں دن سولہ گھنٹے روزانہ دوروں اور جلسوں میں سخت محنت نہ صرف خود کی بلکہ اپنے ساتھیوں اور کارکنوں میں بھی مستعدی اور جٹ کر کام کرنے کی لہر دوڑا دی۔ ''ساؤتھ ایوینیو کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں سلمان خورشید، جناردھن دویدی اور جے رام رمیش اور دوسرے کانگریس مدبر 24 گھنٹہ انتخابی ماحول اور رجحانات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ چناؤ مہم میں پیشہ ور اور تجربہ کار اداروں لیو برنیٹ اور پرفیکٹ ریلیشنز کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کانگریس نے علاقائی حکمت عملی اپناتے ہوئے نعرہ دیا کہ 'عالمی سطح پر سوچو مگر کام مقامی ضروریات کے مطابق کرو'۔ علاقائی اخبارات و میڈیا کے ذریعہ 80 فی صد اشتہارات دیئے گئے۔ جس سے اس نے بھارتیہ جنتا پارٹی پر فوقیت حاصل کر لی۔ عام آدمی کا چرچا اتنے زور و شور سے کیا گیا کہ مخالفین حیرت میں پڑ گئے۔ کسانوں کی اجتماعی خودکشی، گجرات کے فسادات، یونٹ ٹرسٹ کے گھپلہ اور کارگل میں کام آنے والے سپاہیوں کے تابوتوں کی خریداری میں خورد برد، ملک

میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور مفلسی جیسے مسائل کو لے کر ووٹروں سے اپیل کی گئی کہ وہ بی جے پی اوراس کی بنائی سرکار کورد کردیں۔سماجیات ومعاشیات کے ماہرین نے اعداد وشمار سے ثابت کردیا کہ چھ سال کے اقتدار میں بھارتیہ جنتا پارٹی عام آدمی کی حالت اور حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکی۔سونیا اور کانگریس کی انتخابی مہم میں ''ہندوستان چمک رہا ہے'' کے نعرہ کے کھوکھلے پن اور جھوٹ کا پردہ چاک کیا گیا۔

انتخابات کی تاریخوں کے اعلان کے بعد سونیا نے 70000 کیلومیٹر سے زیادہ سفر کیا اور یہ اندازہ لگایا کہ ملک قیادت میں تبدیلی چاہتا ہے۔

سونیا کے ساتھ انتخابی مہم میں ووٹروں کے مطالبہ پر راہل اور پرینکا کے علاوہ گووندا، سنیل دت اوردلیپ کمار نے اور کانگریسی لیڈروں یا ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے مقابلہ میں کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔منموہن سنگھ، کمل ناتھ، امبیکا سونی، دگ وجے سنگھ، احمد پٹیل، محسنہ قدوائی وغیرہ کم ہی جگہوں پر کنونسنگ کے لئے گئے۔اورزیادہ تر لیڈروں نے دہلی ہی میں قیام کرنا پسند کیا۔اس کے مقابلہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے اٹل بہاری، ایل کے اڈوانی، ارون جیٹلی، پرمودمہاجن، سشما سوراج اور نریندر مودی نے ووٹروں کو پرچانے اور لبھانے میں زمین آسمان ایک کردیا۔

بی جے پی کے نعرہ ہندوستان چمک رہا ہے کے جواب میں کانگریسیوں نے ''کانگریس کا ہاتھ غریبوں کے ساتھ'' کا نعرہ بلند کیا جس میں بعد میں راہل کے مشورہ پر غریب کی جگہ عام آدمی کردیا گیا تھا۔

ووٹنگ کے دوران اوراس کے ختم ہونے کے بعد نیشنل نیوز نیٹ ورک اور ملک کے اخباروں نے اپنے قیاسات اور جائزوں کی بنیاد پر زور وشور کا دعویٰ کیا کہ الکشن میں نیشنل ڈیموکریٹک الائنس بھاری اکثریت سے جیت رہا ہے اور کانگریس کو مشکل سے 92 یا 102 سیٹیں مل پائیں گی۔صرف ایک اندازہ کے بموجب اسے زیادہ سے زیادہ 190 اور 205 کے بیچ نشستیں مل سکتی تھیں۔لیکن جب 13 مئی 2004 کو نتائج کا اعلان ہوا تو ہر ایک یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ

کانگریس کو 216 سیٹیں مل گئی تھیں۔

چناؤ کے رجحانات اور ممکنہ نتائج کے بارے میں سونیا گاندھی اور ان کے نزدیکی ساتھی خوب بحث مباحثہ کرتے اور ٹیلی ویژن اور اخباروں کی رپورٹوں کا تفصیل سے جائزہ لیتے رہے۔ راہل اور پرینکا کچھ خاص حلقوں کے نتائج کے بارے میں میڈیا کی رپورٹوں سے اختلاف ظاہر کرتے رہے۔ مگر سونیا کا رویہ ہمیشہ محتاط رہتا اور وہ قطعیت سے کسی نتیجہ پر اپنی رائے ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ چناؤ مہم اور نتائج سے اعلان سے پہلے لوگوں کو ایک خود اعتمادی اور معقولیت کے پیکر میں ایک نئی سونیا گاندھی نظر آئیں۔ وہ کبھی بے ساختگی سے کسی پیش قیاسی یا رپورٹ پر ہلکا پھلکا تبصرہ کر دیتی تھیں۔ مثلاً ایک ٹی وی چینل پر یہ دکھایا گیا کہ آندھرا میں لوک سبھا کی نصف سیٹوں پر چندرا بابو نائیڈو کی پارٹی جیت جائے گی۔ تو سونیا نے فوراً اس کی تردید میں کہا۔ ''یہ کبھی بھی سچ نہیں ہو سکتا'' چنانچہ جب آندھرا میں اسمبلی کے ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تو صبح ہی سے کانگریس کا پلّہ بھاری دکھائی دینے لگا اور دہلی ریاستی کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری شمیم احمد بے ساختہ چلا اٹھے'' آج آندھرا پردیش کل سارا دیش''۔

12 مئی کو 10 جن پتھ پر ایک غیر متوقع شخص سونیا سے ملنے آئے۔ یہ تھے مشہور پرائیویٹ صنعت کار انل امبانی۔ یوں تو اس ملاقات کو رسمی اور نجی بتایا گیا مگر اس خبر نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے ہیڈ کوارٹر 11 راشوک روڈ میں اضطراب اور ہلچل کی کیفیت پیدا کر دی۔ بی جے پی کے ایک اونچے لیڈر نے یہ سن کر فوراً کہا'' امبانی گروپ کے اندازے بہت کم غلط نکلتے ہیں''۔ ان کی بات کو لوگوں نے صحیح نہ جانا پھر بھی پارٹی کے عہدیدار اٹل بہاری کو لوک سبھا میں اکثریت نہ حاصل کرنے کی صورت میں کچھ اور پارٹیوں کے ساتھ ہاتھ ملانے کی سوچنے لگے۔

13 مئی کے الکشن کے نتائج دیکھ کر اٹل بہاری واجپئی پر بالکل خاموشی طاری ہوگئی۔ انھوں نے اپنے ان مشیروں کو خشمگیں نظروں سے دیکھا جوان کو الکشن جلدی کرانے اور 'ہندوستان چمک رہا ہے' کے نعرہ کی کامیابی کا یقین دلا رہے تھے۔ ان لوگوں میں پرمود مہاجن، سشما سوراج،

ارُن جیٹلی اور وینکیا نائیڈو کے مرتبہ کے لیڈر شامل تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں رہ گئی کہ کسی متبادل وزیر اعظم کا نام اپنی زبان پر لا سکتے۔

13 رمئی کا دن سونیا نے ٹیلی ویژن دیکھنے میں گزارا جس پر کانگریس کے امیدواروں کی فتح کی خبریں دکھائی جارہی تھیں۔ وہ اعداد وشمار کو کاغذ پر لکھتی بھی جاتی تھیں۔ جب پریزکا ان کے گھر پہنچیں تو خوب مسکرا کر زوردار لہجہ میں بولیں ''ارے ہم نے جیت کر دکھا دیا''۔ پریزکا نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور دونوں راجیو کی تصویر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ سونیا گاندھی شرد پوار کے گھر مبارکباد دینے گئیں اور جب ایم کرونا ندھی ان سے ملنے آئے تو پورٹیکو میں نکل کر ان کا استقبال کیا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری ہرکشن سنگھ سرجیت سے احترام اور گرم جوشی سے ملیں۔ اس طرح اب سونیا کے وزیر اعظم بننے کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اس کے بعد جس تدبرّ اور دوراندیشی کا انھوں نے مظاہرہ کیا اس کو تاریخ مدتوں تک یاد رکھے گی۔

17 رمئی کو انھوں نے اپنے حلیفوں سے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ وزیر اعظم بننا نہیں چاہتی ہیں اور اس مضمون کا ایک خط اپنے ہاتھ سے اپنی پارٹی اور دوسری اتحادی پارٹیوں کے ممبران کے نام ٹائپ کیا۔ مگر جب کانگریس پارلیمانی پارٹی کے 200 سے زائد ممبر سخت گرمی میں ان سے ملنے 10 جن پتھ پر پہنچے تو وہ ان سے ملنے کے لئے باہر نہ نکلیں۔ جس سے ان میں بددلی پھیل گئی اور انھوں نے ٹھنڈے مشروب کے گلاسوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ذرا دیر بعد ڈاکٹر منموہن سنگھ اور پرنب مکرجی نے یہ اعلان کیا کہ سونیا دوسرے دن صدر کلام سے ملنے جائیں گی۔ اس سے ممبران کو اطمینان ہوا کہ سونیا وزیر اعظم بننے کے لئے تیار ہیں۔ مگر 18 رمئی کی سہ پہر کو انھوں نے منموہن سنگھ کے ذریعہ اپنے ساتھیوں کو اپنا یہ قطعی فیصلہ سنا دیا کہ وہ وزیر اعظم کا عہدہ نہیں قبول کریں گی۔ ان کے اس دوٹوک فیصلہ کا علم ان کے نزدیک رہنے والے احمد پٹیل اور امبیکا سونی تک کو نہیں تھا۔ ان کے انکار کو سن کر امبیکا سونی نے ان سے احتجاج کیا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ 10 جن پتھ پر اس وقت عجیب منظر دیکھنے میں آرہا تھا۔ وفادار

جنرل سکریٹری کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور سونیا گاندھی اپنے رفیقوں سے کہہ رہی تھیں کہ اگر انھوں نے اپنا اصرار جاری رکھا تو وہ کانگریس کی صدارت سے بھی الگ ہو جائیں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سونیا وزیر اعظم کی دوڑ میں کیوں نہیں شامل ہوئیں؟ کیا انھیں لالو پرشاد یادو اور رام ولاس پاسوان کی وفاداری پر شک تھا؟ کیا انھیں خود پر بھروسہ نہیں تھا؟ مگر تھوڑے سے غور کے بعد اس سوال کا صحیح جواب مل جاتا ہے۔ سونیا کا فیصلہ غیر معمولی سیاسی سوجھ بوجھ کا حامل تھا اور اس کے پیچھے قابل تعریف اخلاقی انداز فکر تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ملک کا کوئی حلقہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا اور غیر اہم ہو ان کے وزیر اعظم ہونے سے ناراض یا غیر مطمئن ہو۔ بقول ان کے ''مجھے سشما سوراج، اُما بھارتی وغیرہ کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں، البتہ میں ملک میں اپنی وجہ سے کسی بھی قیمت پر خانہ جنگی نہیں ہونے دوں گی''۔ اس کا مطلب ہے کہ انھیں احساس تھا کہ کہیں ان کے غیر ملکی ہونے کے مسئلہ پر کانگریسی کارکن سنگھ پریوار کے پرجوش حامیوں سے لڑنا نہ شروع کردیں۔ جب کہ اس وقت ملک کو معاشی بدحالی، پینے کا پانی، حفظان صحت، سماجی تحفظ، تعلیم وغیرہ کی شدید مشکلات کو حل کرنے کی ضرورت تھی نہ کہ ان کی شہریت کے معاملہ میں آپس میں لڑنے جھگڑنے کی۔ اسی لئے انھوں نے نہرو-گاندھی خاندان کی دیرینہ روایات کے متعلق ملک کی اہمیت اور برتری کو اپنی ذات پر ترجیح دی۔ ایک اہم کانگریسی عہدہ دار آسکر فرنانڈیز کا جو بعد میں منموہن سنگھ سرکار میں وزیر بھی ہو گئے بیان ہے کہ بہت سے موقعوں پر سونیا نے قربانی اور صبر وضبط کا مظاہرہ کیا۔ مثلاً 2003 میں جب کانگریس حزب مخالف تھی تو ایک دفعہ اس کی طرف سے ملک بھر میں ایک روز ''ریل روکو'' اور ''سڑکوں کو بند کرو'' کا پروگرام سرکار کی غلط پالیسیوں کے خلاف بطور احتجاج چلانے کی تجویز پیش کی گئی۔ امبیکا سونی اور بہت سے کانگریسی لیڈروں نے ان سے کہا کہ اس پروگرام کی کامیابی سے پورے ملک خاص کر میڈیا کو کانگریس کی طاقت اور ہر دل عزیزی کا پتہ چل جائے گا۔ سونیا گاندھی نے خاموشی کے ساتھ ان لوگوں سے صرف یہ سوال کیا ''اس صورت میں ان گنت بیمار اسپتال نہ پہنچ

پانے اور علاج کی سہولت نہ ملنے سے مرجائیں گے تو ان کی موت کا کون ذمہ دار ہوگا''؟ ظاہر ہے اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا چنانچہ اس تجویز کو واپس لے لیا گیا۔

اسی طرح اپریل 1999 میں جب اٹل بہاری حکومت کو عدم اعتماد کی وجہ سے ہٹنا پڑا تو ان کی جگہ سونیا کو وزارت عظمٰی دینے کی مخالفت سماج وادی اور دوسری پارٹیوں نے کی تھی اور ایسا نہیں ہوسکا تھا۔ اس سلسلہ میں اکتوبر 2006 میں این ڈی ٹی وی پر ویر سنگھوی کو انٹرویو دیتے ہوئے سونیا نے کہا ''میں نے وزیراعظم نہ ہونے کا جو فیصلہ کیا وہ ایک دم سے یا فوری طور پر نہیں کیا بلکہ یہی صورت 1999 میں بھی تھی جب میں اپنی جگہ منموہن سنگھ کو وزیراعظم کی کرسی پر دیکھنا چاہتی تھی اور یہ بات میں نے صدر کے آر نارائنن سے کہی جب میں دوبارہ ان سے منموہن سنگھ کے ساتھ ملنے گئی۔ اس وقت کئی پارٹیوں نے خطوں کے ذریعہ مجھ سے وزیراعظم ہوجانے پر اصرار کیا''۔

جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ انھوں نے وزیراعظم کے عہدہ سے انکار 13 رمئی ہی کو کیوں نہیں کردیا۔ تو جواب میں انھوں نے کہا ''میں اس لئے خاموش رہی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کانگریس پارٹی کے ولولہ یا جوش میں فرق آئے یا میرے انکار سے آپس میں تفرقے پیدا ہوجائیں۔ اگر میں وزیراعظم نہ بننے کا اعلان کردیتی تو متحدہ پروگریسو محاذ ٹھیک سے نہ بن پاتا اور اس کے سیماب صفت حلیف بھی صبر نہ کرپاتے''۔

سونیا نے اس فیصلہ میں اپنے بچوں اور اپنے کچھ غیر سیاسی دوستوں سے مشورہ کیا جنھوں نے اس کی پرزور تائید کی، خاص کر راہل نے۔

دوسری طرف راشٹریہ سیوک سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو یقین تھا کہ ''لالچی'' سونیا وزیراعظم کے عہدہ کو لپک کر قبول کریں گی۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ اگر ایک اطالوی لیڈر کو وزیراعظم بنا کر ملک پر مسلط کردیا گیا تو اس بے عزتی کو ملک کے عوام ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ اور پورے ملک کو کانگریس اور بے اصول کمیونسٹ پارٹیوں کی اس حرکت سے سخت تکلیف پہنچے گی۔ مگر 18 رمئی کے سونیا کے فیصلہ نے ان سب کو خاموش کردیا۔ حالانکہ کچھ این ڈی اے کے سابق وزرا

نے سونیا کے اس فیصلہ کو ایثار وقربانی پر نہیں بلکہ کچھ عملی دشواریوں کا نتیجہ قرار دیا اور یہ شوشہ بھی چھوڑا کہ صدر اے پی جے عبدالکلام نے بھی سونیا کی شہریت پر شبہ ظاہر کیا تھا۔ مگر جب دو اخباروں میں یہ خبر چھپی تو صدر جمہوریہ کے دفتر سے اس کی پرزور تردید خطوں اور فون کے ذریعہ کی گئی۔

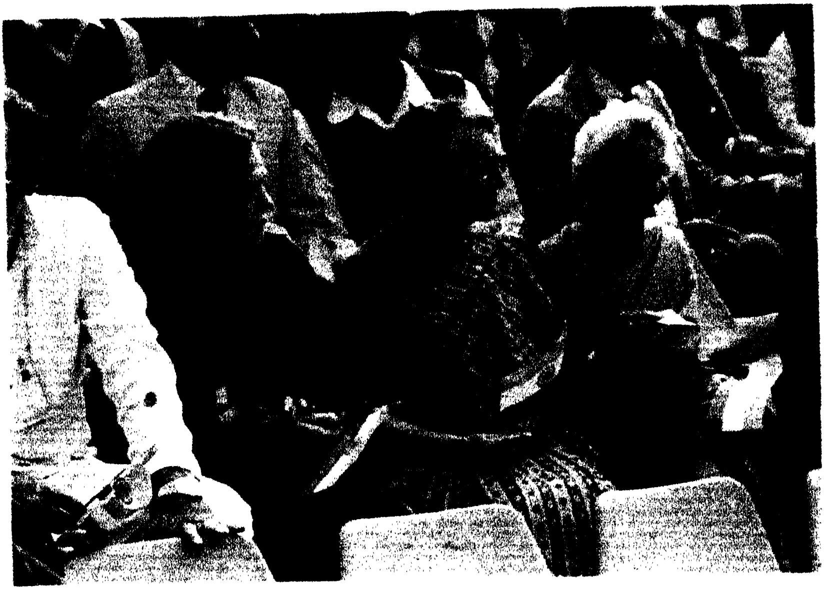
جو لوگ سونیا کو جانتے تھے انھیں اس فیصلہ پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ انھیں علم تھا کہ ان کی جتنی مخالفت کی جاتی ہے اتنی ہی ہمت اور حوصلہ سے وہ حملوں کا جواب دیتی ہیں اور ناخوشگوار اور مرضی کے خلاف فیصلے دل جمعی اور سکون سے لیتی ہیں۔ مثلاً راجیو گاندھی کا سیاست میں حصہ لینا، اندرا جی کے بعد وزیراعظم بننا اور پھر پارٹی کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے کانگریس کی صدارت قبول کرنا وغیرہ۔ اسی لئے انھوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں کے خلاف اپنی ضمیر کی آواز کے مطابق وزیراعظم کا عہدہ لینے سے انکار کیا۔

سونیا گاندھی نے پارلیمنٹ ہاؤس کے شاندار سنٹرل ہال میں کانگریس کی پارلیمانی پارٹی کے ممبروں کے سامنے مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے کہا ''میں گزشتہ چھ سال سے سیاست میں حصہ لے رہی ہوں مگر مجھے کبھی بھی وزیراعظم بننے کی تمنا نہیں ہوئی۔ آج بھی میں نے اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہوئے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ آپ نے مجھے متفقہ طور پر اپنا لیڈر چنا ہے اور آپ کو مجھ پر پورا بھروسہ ہے۔ میں آپ کے محبت بھرے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ اس وقت ہم سب کا اہم ترین فریضہ ملک وقوم کی خدمت کرنا، اس کے سیکولر کردار کو قائم رکھنا اور اندرا جی اور راجیو گاندھی کے نقش قدم پر چل کر اس کو مفلسی اور جہالت سے نکالنا ہے۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ مجھ پر فیصلہ بدلنے کے لئے اصرار نہ کریں۔ کیونکہ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ میں آپ کی بے لوث محبت اور بے پایاں خلوص کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور درخواست کرتی ہوں کہ ملک کو چلانے کے لئے ایک مضبوط سیکولر حکومت کی تشکیل کریں''۔

اس تقریر کے سننے والوں میں غصہ، رنج اور تعجب کے ملے جلے تاثرات پیدا ہوئے۔ جلسہ

نے اتفاق رائے سے کانگریس پارلیمانی پارٹی کے دستور کی دفعہ 5 (سی) میں یہ ترمیم منظور کی کہ سونیا گاندھی کو کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا صدر (چیر پرسن) مقرر کیا جائے اور ان کو پورا اختیار وزیر اعظم کو مقرر کرنے اور ہٹانے کا دیا جائے۔ اس طرح سونیا نے اپنے فیصلہ کو خوش اسلوبی سے کانگریس پارٹی سے منوالیا۔ ان کے تدبر کی تعریف لندن کے اخبار 'گارجین' نے اپنے اداریہ میں کی اور اسے ہندوستان کی سچی روایات کا نمونہ قرار دیا۔ اس کی پرزور تائید پاکستان کے مشہور اخبار 'ڈان' نے کی اور یہ لکھا کہ پاکستان کے ارباب حل وعقد کو بھی ان کی تقلید کرنا چاہیے۔ ان سے ملنے سیاسی لیڈر، صحافی اور عام کانگریسی بڑی تعداد میں آتے رہے جس میں شرد پوار خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے ان کی غیر ملکی شہریت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور اب منموہن سنگھ کی حکومت میں وزیر غذا اور زراعت بن بیٹھے تھے۔

سونیا نے سوچ سمجھ کر ڈاکٹر منموہن سنگھ کو وزیر اعظم بنایا جو اپنی لیاقت، ایمانداری اور صاف ستھری شخصیت کے لئے مشہور تھے اور عام سیاسی جھگڑوں سے دور رہتے تھے اور ہمیشہ سونیا کے طرف دار سمجھے جاتے تھے۔ سونیا ان کے ماہر معاشیات اور دیگر خصوصیات کے حامل ہونے کی بنا پر ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان کو پہلے راجیہ سبھا میں حزب مخالف کا لیڈر اور کانگریس کی اسٹریٹیجی کمیٹی کا صدر بنایا تھا۔ چنانچہ اب بھی صدر کانگریس اور وزیر اعظم کے درمیان بڑے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر پورا بھروسہ کرتے ہیں۔



سونیا اپنی ساس اندرا گاندھی کے ساتھ جن سے ان کے بڑی گرمجوشی کے تعلقات تھے۔



سونیا اور راجیو گاندھی پوپ جان پال دوم کے ساتھ جب وہ 1986 میں ہندوستان آئے تھے۔ سونیا کی پرورش قدامت پسند کیتھولک ماحول میں ہوئی ہے۔



سونیا وزیراعظم نرسمہا راؤ کے ساتھ 1991 میں۔ انھیں راجیو گاندھی کی وفات کے بعد
کانگریس کا سربراہ چنا گیا تھا۔



مینکا اور سنجے گاندھی۔ سنجے 23 جون
1980 کو ایک ہوائی حادثہ میں
ہلاک ہوگئے تھے۔



سونیا1996 میں تین مورتی بھون میں اپنے بچوں پرینکا اور راہل کے ساتھ۔



سونیا (دائیں طرف) ہیلیری کلنٹن (دائیں طرف سے تیسرے نمبر پر) کلکتہ میں مدر ٹیریسا کی تدفین کے موقعہ پر 1997 میں۔ پرینکا گاندھی سونیا کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہیں۔



2000 میں سونیا بحیثیت صدر کانگریس جب ان کی آزمائش لی گئی۔



سونیا گاندھی گوہاٹی میں کانگریس کے زیر اقتدار ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کانفرنس میں حصہ لیتی ہوئی جو اپریل 2002 میں منعقد ہوئی۔ ان کے دائیں طرف کتاب کے مصنف رشید قدوائی اور بائیں طرف کمل ناتھ کانگریس کے جنرل سکریٹری نظر آرہے ہیں۔



23 مارچ 2006 کو 10 جن پتھ نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں منفعت بخش پیشہ میں ہونے کی بنا پر لوک سبھا سے اپنی سیٹ سے استعفیٰ دینے کا اعلان کرتے ہوئے سونیا گاندھی۔ راہل ان کے پاس کھڑے ہیں اور پرینکا پچھلے دروازہ سے جھانک رہی ہیں۔



2008 میں 10 جن پتھ پر صدر کانگریس سونیا گاندھی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں وزیراعظم منموہن سنگھ کا استقبال کرتے ہوئے۔



2001 نئی دہلی میں سونیا گاندھی بے نظیر بھٹو سے ملاقات کرتے ہوئے۔ نٹور سنگھ جو بعد میں
یوپی اے سرکار کے وزیر خارجہ ہوئے انھیں دیکھ رہے ہیں۔



3 اگست 2008 کو سونیا گاندھی مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی لیڈر ہرکشن سنگھ سرجیت کی تجہیز و تکفین
میں۔ان کے پاس (بائیں سے تیسرے نمبر پر) یوپی کی وزیر اعلا مایاوتی اور سامنے سماج وادی
پارٹی کے لیڈر رام سنگھ اور ملائم سنگھ یادو کھڑے ہیں۔



ہرکشن سنگھ سرجیت کی تجہیز و تکفین کے موقعہ
پر سونیا گاندھی مارکسسٹ کمیونسٹ لیڈر
پرکاش کرات سے دعا سلام
کرتے ہوئے۔

پارٹی، حکومت اور متحدہ محاذ

2004 کے جنرل الکشن میں کامیابی کے بعد سونیا گاندھی ایک نئی اور بدلی ہوئی شخصیت کے جامہ میں عوام کے سامنے آئیں۔ وہ مختصر گفتگو ہی میں ملنے والوں کا مطلب سمجھ لیتی تھیں اور بلا کسی رعایت کے صاف اور دوٹوک جواب دے دیتی تھیں جس سے ان کی شہرت اور ہردل عزیزی میں بڑا اضافہ ہوا۔ کانگریس میں نرسمہاراؤ کے زمانہ میں طاقت کے دو مرکز وزیراعظم کا دفتر اور 10 جن پتھ بن گئے تھے جس کی وجہ سے پارٹی میں تفرقہ پڑا۔ پھر 1996 اور 1998 کے الکشن ہوئے۔ اب لوگوں کی نظر اس پر تھی کہ راہل گاندھی کب اور کس طرح سیاست میں داخل ہوں گے اور اس کی کیا صورت ہوگی۔ سونیا گاندھی کے وزیراعظم کے عہدہ سے انکار کی وجہ سے ملک کی سب سے قدیم پارٹی (کانگریس) کے سامنے پھر طاقت کے دو مرکزوں کا سوال پیدا ہوگیا۔ آزادی سے قبل پارٹی کو سیاسی طاقت حاصل تھی مگر 1947 میں آزادی ملنے کے بعد حکومت کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں آئی تو پنڈت جواہرلال نہرو کی حکومت اور آچاریہ کرپلانی کی زیرصدارت کانگریس میں آویزش کا سلسلہ شروع ہوا۔ کرپلانی نے پنڈت نہرو سے مطالبہ کیا وہ اہم انتظامی معاملات پر فیصلہ لینے سے قبل پارٹی ہائی کمان سے مشورہ کریں اور اس پر عمل کریں۔ ظاہر ہے نہرو بھلا اس کو کیوں ماننے لگے تھے۔ شاید کرپلانی بھول گئے کہ کانگریس کے چوٹی کے لیڈر نہرو کی وزارت میں شامل ہو گئے تھے اور اب پارٹی میں غیر اہم یا دوسرے درجہ کے لیڈر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد 1952 میں جب پرشوتم داس ٹنڈن جو اپنے ہندووادی نظریوں کے لئے بدنام تھے

کانگریس کے صدر ہوئے تو انھوں نے بھی نہرو سے پنجہ آزمائی کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کانگریس ورکنگ کمیٹی نے استعفیٰ دے دیا اور ٹنڈن جی کو دوبارہ نہرو جی کے سامنے آنے کی ہمت نہ پڑی۔ اندرا گاندھی برسر اقتدار آئیں تو انھیں سینیر کانگریسی لیڈروں کے طاقتور سنڈیکیٹ سے سابقہ پڑا جو انھیں ایک معمولی درجہ کی ایسی عورت سمجھتا تھا جو ان کے اشاروں پر ہمیشہ چلے گی اور اسی لئے کامراج نجلنگپا، ایس کے پاٹل وغیرہ نے انھیں لال بہادر شاشتری کی جگہ وزیر اعظم بنایا تھا۔ مگر جلد ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور نئے وزیر اعظم نے ان کو پارٹی سے نکال کر اپنی طاقت اور برتری کا لوہا منوالیا۔

ظاہر ہے سونیا گاندھی، جواہر لال اور اندرا کی طرح طاقتور وزیر اعظم تو تھیں نہیں اور ان کے بنائے ہوئے وزیر اعظم ایک لائق ماہر معاشیات ہونے کے باوجود اپنے سیاسی مخالفین سے داؤ پیچ میں کہیں پیچھے تھے۔ لیکن کانگریس کے دستور میں ترمیم ہونے کے بعد سونیا گاندھی پارلیمنٹری پارٹی کی صدر منتخب ہوگئیں اور وزیر اعظم ان کے نامزد کردہ امیدوار کی طرح سرکار کا کام چلانے لگے۔ اس طرح ان کے زمانہ میں پارٹی میں طاقت کے دو مرکز نہیں بن پائے۔ پارٹی کے صدر کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ۔ دونوں ایوانوں میں لیڈر ڈپٹی لیڈر اور چیف جب جس کو چاہے مقرر کردے۔ اس طرح پارٹی کے تنظیمی اور پارلیمانی بازوؤں میں کوئی کشمکش یا رقابت نہیں ہونے پائی۔ منموہن سنگھ نے واضح اور غیر مشروط الفاظ میں سونیا کی ہدایتوں پر چلنے کا وعدہ کیا۔ ادھر سونیا نے ایک کارگزار آئی اے ایس افسر پولک چٹرجی کو اپنے اور وزیر اعظم کے درمیان تمام انتظامی اور سرکاری معاملات کے نپٹانے کے لئے مقرر کیا۔ چٹرجی اگرچہ سیاست سے دور رہتے تھے مگر تمام ممبران پارلیمنٹ اور کانگریسی کارکن ان کی عزت کرتے اور ان سے خوشگوار تعلقات رکھتے اور یہی رویہ چٹرجی کا بھی تھا۔ مگر وہ کسی کو زیادہ بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کسی سیاسی شخصیت کی جگہ ایک ہوشیار بیوروکریٹ کو یہ جگہ دے کر سونیا اور منموہن سنگھ بہت سی پریشانیوں سے بچ گئے اور ان کو میڈیا کا بار بار سامنا کرنا نہیں پڑا۔

اس ماحول میں ارجن سنگھ اور شرد پوار دونوں نے خرابی صحت کے باوجود یونائٹڈ پروگریسیو اتحاد کی حکومت میں اپنی سیاسی طاقت بڑھانا اور جمانا چاہی اور اس کے لئے وہ لالو پرساد یادو اور سرکار کا باہر سے ساتھ دینے والی بائیں بازو کی پارٹیوں سے بھی قریب ہو گئے۔ پوار سونیا کے خلاف اور ارجن سنگھ نرسمہا راؤ کے خلاف بغاوت کر چکے تھے۔ اس طرح وزارت میں کچھ 1991-1996 کی سی صورت حال پیدا ہوگئی اور منموہن سنگھ کو اپنے ان دونوں حوصلہ مند ساتھیوں سے کچھ خطرہ یا بے اطمینانی محسوس ہونے لگی۔ مگر 2004 میں سونیا جیسی طاقتور شخصیت ان پر پوری نظر رکھے ہوئے تھی۔ چنانچہ سونیا نے پہلے تمام ممبران پارلیمنٹ کو ہدایت کی کہ وہ وزیراعظم کے کاموں میں دخل نہ دیں اور پھر سینیر وزیروں کو الگ الگ بلا کر کہا وہ اپنی وزارتوں سے کام رکھیں اور وزیراعظم کو پوار تعاون دیں۔ اس طرح تدبر اور حکمت عملی سے سونیا نے صورت حال پر قابو رکھا۔ پھر بھی 2004 اور 2006 کے درمیان متحدہ حکومت کو کانگریس وزیروں کی طرف سے کچھ الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً ارجن سنگھ نے اعلیٰ تعلیمی اداروں آئی ٹی آئی اور آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے داخلوں میں دیگر پسماندہ ذاتوں کے لئے کوٹا مقرر کر دیا۔ وزارت خارجہ میں والکر رپورٹ کی اشاعت کی وجہ سے وزیر خارجہ نٹور سنگھ کو اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا۔ مگر ارجن سنگھ زیادہ ہوشیار نکلے انھوں نے متحدہ محاذ کی حکومت کے کم سے کم مشترک پروگرام کے تحت پسماندہ ذاتوں کی تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں پولک چٹرجی کے ایک نوٹ کی بنیاد پر ان کے لئے کوٹا مقرر کر دیا۔ جس پر ملک میں احتجاج، اسٹرائیک اور تشدد آمیز مظاہرے ہونے لگے۔ شروع میں سونیا اور منموہن سنگھ خاموشی سے حالات کا مطالعہ کرتے رہے۔ ارجن سنگھ نے اپنے فیصلہ کو بدلنے سے انکار کیا اور وزیراعظم کے مقرر کردہ نالج کمیشن کے ان ممبروں پر شدید نکتہ چینی کی جو پسماندہ ذاتوں کو کوٹا دیئے جانے کے مخالف تھے اور جس میں سرفہرست سیم گنگارام پیٹروڈا تھے جنھوں نے ہندوستان میں ٹیلی کمیونیکیشن کے میدان میں زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا اور جنھیں لوگ سیم پٹروڈا کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔ ادھر والکر کمیٹی نے جسے اقوام متحدہ نے قائم کیا تھا اپنی

رپورٹ میں آئل فارفوڈ پروگرام میں وزیر خارجہ نٹور سنگھ اور کچھ ہندوستانی کمپنیوں پر بدعنوانیوں اور مالی خورد برد کا الزام لگایا جس نے بڑا طول کھینچا۔ نٹور سنگھ کو اس وقت استعفیٰ دینا پڑا جب پارٹی ہائی کمانڈ کی پوزیشن نازک ہوگئی۔ خود کانگریسیوں نے کہنا شروع کیا کہ نہرو، گاندھی خاندان کے وفاداروں کو ایک ایک کر کے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسی زمانہ میں ارجن سنگھ نٹور سنگھ کے ساتھ شیلا دکشت، غلام نبی آزاد، آر کے دھون اور این ڈی تیواری کا اثر 10 جن پتھ میں گھٹنے لگا اور پرنب مکر جی اور پی چدمبرم کا رتبہ ان کے مقابلہ میں بڑھ گیا۔ غلام نبی آزاد کو اپنی مرضی کے خلاف دہلی چھوڑ کر سونیا کے حکم کے مطابق کشمیر جانا پڑا۔ نرائن دت تیواری بھی اترانچل اسمبلی میں کانگریس کی شکست کے بعد کسی راج بھون میں بحیثیت گورنر کے بھیجے جانے کے لئے ہاتھ پیر چلانے لگے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ امرنیدر سنگھ کو بھی ایک سال سے زائد کی مدت میں سونیا سے ملنے کی اجازت نہ مل سکی۔

مگر سونیا کے نزدیکی حلقوں نے ان خبروں کی تردید کی اور کہا کہ صدر کانگریس پارٹی لیڈروں میں کسی کے ساتھ کوئی تفریق یا امتیاز نہیں برتتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے پرانے وفاداروں کو ان کی بے اعتنائی کا شکوہ رہا اور اسی کے ساتھ ہی یہ امید بھی کہ ایک دن وہ ان کی طرف ضرور توجہ کریں گی۔

نٹور سنگھ سے البتہ سونیا گاندھی خاصی ناخوش ہوگئیں اور انھوں نے ویر سنگھوی سے کہا ''جب والکر کمیٹی کی رپورٹ میں ان کی بدعنوانیوں کا پردہ فاش کیا گیا تو میرے رنج وغم کی کوئی حد نہیں رہی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا خاص معتمد مجھے اس طرح دھوکا دے گا''۔ انھیں روس کا جون کا دورہ یاد آ گیا جس میں وہ نٹور سنگھ کے ساتھ ولادیمیر اور سوزدال کے پرانے شہر دیکھنے گئیں اور وہاں انھوں نے صدر پوتین اور نٹور سنگھ کو بتایا کہ وہیں ایک جیل خانہ میں ان کے والد دوسری جنگ عظیم کے دوران قید تھے اور یہیں سے بھاگ کر وہ 5000 میل دور روم انتہائی نامساعد موسم اور حالات میں پہنچے تھے۔

ادھر منموہن سنگھ کے اپنے کچھ وزیروں سے چھوٹے موٹے اختلافات ہو گئے پارلیمانی جمہوریت میں ایسی صورت حال کو وزیراعظم اپنی سخت اور مدبرانہ حکمت عملی سے قابو میں لے آتے ہیں مگر بدقسمتی سے منموہن سنگھ پوار، لالو، ڈی مارن اور رام ولاس کے ساتھ ایسا نہ کر سکے۔ سیاسی سطح پر ان سب وزیروں کو اطمینان تھا کہ وزیراعظم کے پاس ان کی کارکردگی کے جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور وہ ان کے من مانے فیصلوں میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتے۔ ایک مرتبہ ایک وزیر مملکت نے وزیراعظم کے ایک پسندیدہ پروجیکٹ کو منظوری دینے سے انکار کر دیا اور وزیراعظم کے دفتر سے موصول ہدایتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ان اطلاعات سے واقف ہونے کے بعد وزیراعظم کے مخالفوں نے کہنا شروع کیا کہ ان کی حیثیت ایک سپر کیبنٹ سکریٹری سے زیادہ کی نہیں جو صرف چھوٹے موٹے معاملات پر اختیار رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے کانگریسی وزیر پرنب مکرجی، کمل ناتھ، پی چدمبرم، ارجن سنگھ، نٹور سنگھ آزادی سے اپنا کام کرتے تھے۔ کبھی کچھ وزیر خصوصی معاشی حلقوں کی تشکیل، فارم سیکٹر کی اصلاحات اور ریزرو بینک کے غیر ملکی بینکوں کی پالیسی کے خلاف پبلک تنقید بھی کر دیتے تھے۔

ستمبر 2006 میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ پرنب مکھرجی اپنی اہمیت کے پیش نظر ڈپٹی پرائم منسٹر بننا چاہتے ہیں۔ گو مکھرجی نے اس کی تردید کی مگر یہ الزام تو بہر حال ان پر لگ گیا۔ جب کسی نے یہ سوال وزیراعظم سے کیا تو سونیا گاندھی نے کڑک کر یہ جواب دیا ''میں پوری ذمہ داری سے کہنا چاہتی ہوں کہ کوئی ڈپٹی پرائم منسٹر مرکزی وزارت میں نہیں ہوگا''۔ اس سخت جواب سے سناٹا چھا گیا۔

کانگریس پارٹی کے پاس کوئی مربوط اور متفقہ معاشی پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ دشواریاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ مثلاً ایک دفعہ ایک وزیر مملکت نے چند اہم معاشی امور پر کچھ منتخب میڈیا ایجنسیوں کو سونیا گاندھی کے بھیجے خطوط کو اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ اور جب اس پر ناگواری کا اظہار ہوا تو لفظی تاویل اور الٹ پھیر سے اس کی معذرت کر لی۔

خود منموہن سنگھ ماہر معاشیات ہونے کے باوجود معاشی مسائل پر پارٹی میں کوئی بحث مباحثہ کرنے سے اس لئے کتراتے تھے کہ لوگ ان کی بات سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔

ملکی معاملات پر سونیا جو خطوط لکھا کرتی تھیں ان پر بھی خاصی لے دے ہوئی۔ کانگریس کے ایک طبقہ کا خیال تھا کہ خطوط کی یہ ڈپلومیسی پارٹی اور حکومت کے مفاد میں نہیں۔ مثلاً جب غیر ملکی سرمایہ کاروں کی ملک کے نجی کاروباروں میں شرکت کے خلاف عوام میں برہمی پیدا ہوئی تو سونیا گاندھی نے جو خط لکھا اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا متحدہ محاذ حکومت کے فیصلوں میں انہی کا حکم چلتا ہے۔ یا جب بڑھتی ہوئی قیمتوں کے خلاف سونیا نے خط لکھا تو ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں ان کی اور وزیر مالیات کی خاصی سبکی ہوئی اور اس کی خبر میڈیا کو پہنچ گئی۔ یہی حال پٹرول کی قیمتوں کے اضافہ اور خصوصی اقتصادی علاقے تشکیل دینے کی سرکاری پالیسی کی وجہ سے کاشت کاروں کو پہنچنے والے نقصان کے بارے میں ہوا۔

معلومات کے حق کے قانون کے تحت ملی ہوئی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ منموہن سنگھ کو ان کی وزارت کے پہلے چار سالوں میں سونیا نے 98 خط لکھے اور ان میں 90 فیصد معاملات پر ان کی ہدایات پر فوراً عمل کیا گیا۔ ان خطوط کی تعداد شروع میں زیادہ تھی مگر بعد میں کم ہوتی گئی۔ یہ خطوط، نیشنل، دیہی روزگار گارنٹی پروگرام، گنگا ایکشن پلان، قدرتی آفات کے روکنے کی کاروائی، 2006-2005 کے بجٹ، وال مارٹ کمیٹی کے ہندوستان میں داخلہ اور فرقہ وارانہ جرائم بل کے متعلق لکھے گئے تھے۔ حزب مخالف نے ان خطوط کی مدد سے یہ الزام لگایا کہ ان میں وزیر اعظم کو ان کی واقعی حیثیت بتائی گئی ہے اور مختلف سرکاری اقدامات پر تنقید کی گئی ہے۔ ان کا اصل مقصد لوگوں کو بیوقوف بنانا ہے مگر یہ بات ہمیشہ چلنے والی نہیں۔

اٹل بہاری واجپئی کے زمانے میں ان کے پرنسپل سکریٹری برجیش مشرا نیشنل سیکوریٹی ایڈوائزر بھی تھے اور اپنی صلاحیت اور پہنچ کی وجہ سے خاص رتبہ کے مالک تھے۔ ان کے زمانہ میں وزیر اعظم کو ملکی اور بیرونی خفیہ ایجنسیاں مثلاً آئی بی، را وغیرہ روزانہ براہ راست خفیہ اطلاعات

نہیں پہنچاتی تھیں۔ بلکہ وہ اپنی رپورٹیں مشرا کو دیتی تھیں جو ان سے وزیراعظم کو واقف کراتے تھے۔

متحدہ محاذ کی حکومت کے زمانہ میں شروع میں یہ ایجنسیاں اپنی رپورٹیں تجربہ کار ڈپلومیٹ جے این دکشت کو دیتی تھیں جو انھیں وزیراعظم کے پاس لے جاتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ ایم کے نارائنن کا تقرر ہوا جو 1992 میں ریٹائر ہو چکے تھے اور مندروں کی یاترا میں لگے رہتے تھے۔ 10 جن پتھ سے ان کی نزدیکی اور پاکستان، چین، نیپال، کشمیر اور نکسلی تشدد کے معاملات میں ان کے سیاسی اور ڈپلومیٹک اقدام اور پولس والوں کے رویہ کے بارے میں سرگوشیاں اور گفتگو ہوتی رہتی تھیں۔

ان حالات میں منموہن سنگھ نے مثبت رویہ اپنایا اور اپنے اوپر کانگریسیوں کی طرف سے کئے حملوں کو صبر سے برداشت کیا۔ مگر انھوں نے کوئی موقعہ ایسا نہیں آنے دیا کہ سونیا گاندھی سے کسی معاملہ پر غلط فہمی یا اختلاف کی نوبت آئے۔ انھوں نے کام کرنے کا بھی ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بعض سینیر سیاست دانوں کے پاس اہم محکمے تو ہیں مگر ان کے عوامی اثر اور کارکردگی میں کمی ہوتی جا رہی ہے اس لئے انھوں نے ارجن سنگھ، انتولے اور میرا کمار کی بجائے جو اہم معاملات پر خطیبانہ انداز کی تقریریں کیا کرتے تھے جونیر سطح پر تقریباً 20 ہوشیار ٹیکنوکریٹ اور تجربہ کار کارکنوں کی مدد لینا شروع کی۔ انھوں نے پلاننگ کمیشن اور این اے سی، فنانس کمیشن اور سائنٹیفک ایڈوائزری کونسل میں تجربہ کار اور بیدار مغز لوگوں کو شامل کیا اور امریکہ پاکستان اور چین سے اہم مذاکرات کے لئے موزوں لوگوں کا انتخاب کیا۔ مونٹیک سنگھ اہلو والیا اپنی لیاقت اور ہوش مندی کی بنا پر سونیا گاندھی اور منموہن سنگھ کے بعد تیسری طاقتور شخصیت کے روپ میں ابھر کر سامنے آئے۔

منموہن سنگھ کے دور کے تیسرے سال میں کچھ سنگین مسائل رونما ہوئے۔ 2008 میں امریکہ کے ساتھ نیوکلیائی سمجھوتے کے مسئلہ میں حزب مخالف کو سونیا گاندھی اور منموہن سنگھ کو بدنام کرنے کا موقع مل گیا۔ ہوم منسٹر شیوراج پاٹل کی دہشت گردوں اور ماؤ وادنکسلیوں کو روکنے میں

ناکامی، اڑیسہ میں کرسچینوں پر حملوں اور کشمیر کی صورت حال کو قابو میں نہ لانے کی بنا پر عام رسوائی اور تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیلی ویژن، اخباروں اور عوامی اجتماعات میں ان کی ناکامی کے ساتھ ہی اچھے کپڑے پہننے اور ٹھاٹھ باٹ سے رہنے کا بھی خوب مذاق اڑایا گیا۔ 13 ستمبر کو جب دہلی کی پررونق بازاروں میں بم پھٹنے کی وارداتیں ہوئیں تو پاٹل کریم رنگ کے بند گلے کے کوٹ میں ملبوس کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں شریک تھے۔ وہ موقعہ واردات اور شہر کے اسپتال میں سونیا گاندھی کے ساتھ مجروحین کو دیکھنے سے قبل اپنے گھر گئے اور نیا سوٹ پہن کر آئے۔ چنانچہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ترجمان روی شنکر پرشاد نے براہ راست پاٹل سے سوال کیا ''لوگوں کی زندگی زیادہ قیمتی ہے یا آپ کی ظاہری ٹیم ٹام اور اچھے کپڑوں کا خبط؟''

پاٹل کے ہمدرد بھی محسوس کرتے تھے کہ پاٹل کو ہوم منسٹری جیسی اہم وزارت دے کر منموہن سنگھ نے غلطی کی تھی کیونکہ پاٹل خود لاتور میں اپنی پارلیمنٹ کی سیٹ بچا نہیں پائے تھے۔ دہلی میں بم پھٹنے کے واقعات کے بعد پاٹل نے پولیس کی کارروائیوں خصوصاً گرفتاریوں اور دہشت گردوں سے مقابلہ کے بارے جو مبالغہ آمیز بیانات حزب مخالف کو مطمئن کرنے کے لئے جاری کئے تھے اس سے مسلمان بھی ان سے ناراض ہو گئے۔ قیمتوں کے مسلسل اضافہ نے بھی کانگریس کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا۔ پھر نیوکلیائی بات چیت کو جتنی اہمیت متحدہ محاذ کی حکومت نے دی اسے بھی عام آدمیوں نے پسند نہیں کیا کیونکہ ان کے خیال میں مہنگائی اور ملک کے تحفظ کے معاملات اس سے زیادہ اہم تھے۔ ان عوامی جذبات کا خیال کر کے سونیا اور منموہن سنگھ کو اپنی حکمت عملی بدلنی پڑے گی۔ حالانکہ پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر تحریک عدم اعتماد میں سونیا اور منموہن سنگھ نے سماج وادی پارٹی کی مدد سے بائیں بازو والی پارٹیوں اور حزب مخالف کو سیاسی شکست دے دی ہے پھر بھی آئندہ الکشن جیتنے کے لئے ان کو اور کانگریس کے کارکنوں کو بنیادی روزمرہ ضرورتوں کو بہتر بنانے کے لئے نیوکلیائی سمجھوتہ سے کہیں زیادہ محنت اور تندہی دکھانی ہوگی۔

راہل گاندھی سیاست میں

شروع میں راہل کو سیاست میں قدم رکھنے میں تامل تھا مگر جنوری 2004 سے انھوں نے الکشن میں خصوصی دلچسپی لینا شروع کی اور اہم جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ ان کے سیاسی شعور اور چوکسی سے سونیا کو بڑی مدد ملی۔ وہ راہل ہی کے مشورہ پر لوگوں سے ملنے اور ان کے جذبات و احساسات کو ٹٹولنے کے لئے میدان میں آگئیں کیونکہ بقول راہل سیاسی جلسوں اور مظاہروں میں زیادہ تر کرائے کے لوگ اور لطف اٹھانے والے تماشائی ہی ہوتے ہیں۔ راہل کو امیٹھی سیٹ سے کانگریس کا امیدوار اس وقت بنایا گیا جب پارٹی کے کارکنان اور منتظمین نے اس پارلیمانی حلقہ کے گھر گھر کا دورہ کر کے ان کی ہردل عزیزی کا اندازہ کرلیا۔ اسی طرح ملک کے 134 پارلیمانی حلقوں میں ان کو سروے سے پتہ چلا کہ یوں تو مقبولیت میں اٹل بہاری سونیا گاندھی سے آگے ہیں مگر سونیا گاندھی کی انتخابی مہم میں پرینکا اور راہل کی شرکت سے سونیا کا پلہ بھاری ہو جائے گا، اس لئے سونیا اور کانگریس کارکنوں نے راہل اور پرینکا دونوں کا سہارا لیا۔ انھوں نے رائے بریلی کی سیٹ کا چارج پرینکا کو دے دیا اور یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ پرینکا پورے ملک میں کانگریس کی انتخابی مہم چلائیں گی۔ مگر پرینکا نے کانگریسی کارکنوں کے اصرار کے باوجود ان کی خواہش پوری نہیں کی کیونکہ انھیں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ اتفاق سے مینکا گاندھی اور ورون بھی راہل کے ساتھ ساتھ سیاست میں داخل ہوئے اور ورون نے بھارتیہ جنتا پارٹی میں شمولیت کرلی۔ ورون، راہل سے عمر میں چھوٹے تھے اور وہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز سے

ڈاکٹریٹ کرر ہے تھے۔ وہ راہل سے برابری کرنے کے لئے لوک سبھا کے الکشن میں حصہ لینا چاہتے تھے مگر چونکہ ان کی عمر 25 سال سے کم تھی اس لئے بی جے پی نے ٹکٹ دینے کے بجائے انتخابی مہم میں پروپیگنڈہ اور پرچار کا کام لیا۔

ورون نے اعلان کیا کہ وہ نہرو- گاندھی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کسی علاقائی یا ذات پات کی بنیاد پر بنی پارٹی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے مگر حالات کی مجبوری نے انھیں ایک قومی پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی میں پہنچا دیا۔ لیکن وہ کسی حال میں اپنے گھرانے کے خلاف یا فرقہ وارانہ معاملات پر کبھی نہیں بولیں گے۔ چنانچہ انھوں نے گجرات جا کر وہاں کے چیف منسٹر نرنیدر مودی پر تنقید کی کہ وہ 2002 کے ہولناک فسادات نہیں روک پائے۔

کہا جاتا ہے کہ بی جے پی میں شامل ہونے سے پہلے ورون نے کانگریس کے ایک وزیراعلیٰ کے ذریعہ سونیا کے پاس پیغام بھیجا مگر اس وزیراعلیٰ نے وہ پیغام سونیا کو نہیں پہنچایا، جس میں راہل کے امیٹھی سے جیتنے کی دعا کی تھی اور بھارتیہ جنتا پارٹی میں شرکت پر اپنی ہچکچاہٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ پھر انھوں نے راہل سے اس معاملہ پر بات کی اور راہل نے افسوس ظاہر کیا کہ وزیراعلیٰ نے ان کا پیغام ان کے گھر والوں تک کیوں نہیں پہنچایا۔

امیٹھی میں الکشن جیتنے کے بعد راہل لڑائی میں الجھے ہوئے کابل کے دورہ پر نٹور سنگھ، نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر ایم کے نرائنن اور وزارت خارجہ کے کچھ ارکان کے ایک وفد میں وزیراعظم کے طیارہ پر گئے۔ وزارت خارجہ کے ممبران نے بتایا کہ وہ کابل کے حالات سے باخبر تھے اور دوران سفر وہ نرائنن اور سنجے بارو کی مدد کرتے رہے اور وزیراعظم کے سرکاری پروگرام سے متعلق پیغامات دیکھتے رہے۔ انھوں نے صدر افغانستان کے محل کے سبزہ زار پر چنار کے درختوں کے نیچے سابق شاہ افغانستان ظاہر شاہ کے پوتے مصطفٰے ظاہر سے ملاقات کی اور ان سے افغانستان کی تاریخ اور ہندوستان وافغانستان کے باہمی تعلقات پر متعدد سوالات کئے جن سے ڈپلومیسی اور سیاست سے ان کی دلچسپی ظاہر ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک انٹرنیشنل کانفرس میں شریک ہونے کے لئے جرمنی گئے

اوراس کے بعدایڈس کے متعدی مرض کے بارے میں اقوام متحدہ کے پروگرام کے تحت معلومات اکٹھا کرنے کے لیے ایک وفد میں برازیل گئے۔ مئی 2005 میں راہل نے ورلڈ اکونومک فورم زیرماٹ (سوئزرلینڈ) میں تقریر کی جس میں وہ 8000 نوجوان مہم کاروں میں سے 238 نوجوانوں (جن کی عمر 40 سال سے کم تھی) میں کمارمنگلم، برلا، راجیو بجاج اورملویندر موہن سنگھ کے ساتھ چنے گئے۔

دہلی میں انھوں نے اپنا باقاعدہ دفتر 12 تغلق روڈ پر کھولا جس کی حفاظت کا معقول انتظام تھا۔ یہاں روزانہ مختلف علوم وفنون کے ماہرین راہل کوٹریننگ دینے آیا کرتے تھے۔ وزیراعظم کیمپ نے زرعی اصلاحات، انڈو امریکہ صلح نامہ اور دیگر سماجی وسیاسی پروگراموں میں اس نوجوان ممبر پارلیمنٹ اور اس کے ساتھیوں کی خدمات سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ سونیا نے راہل کی سیاسی تربیت میں ویسی ہی دلچسپی لی جیسی اندرا نے راجیو گاندھی کے معاملہ میں لی تھی۔ راہل گاندھی نے انفارمیشن ٹکنالوجی کے بادشاہ بل گیٹس سے کھل مل کر گفتگو کی اور ان سے ہندوستان کے حفظان صحت کے پروگرام اور بہار کی معاشی ترقی کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے بل گیٹس کو بتایا کہ ہر سال سینکڑوں آدمی بہار میں کالا آزار کے موذی مرض سے ہلاک ہوجاتے ہیں جس کو انھوں نے اور ان کی بیوی میلنڈا نے دلچسپی سے سنا اور آخر میں یہ وعدہ کیا کہ وہ بہار ضرور جائیں گے۔ سینیر کانگریس لیڈر مرلی دیورا نے جو بل گیٹس کے ساتھ 10 جن پتھ روڈ گئے تھے بتایا کہ وہ راہل کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔

کانگریسیوں کے اصرار پر ستمبر 2007 میں سونیا نے راہل کو کانگریس کا جنرل سکریٹری بنایا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان کی ساس اندرا گاندھی نے فروری 1983 میں اپنے ہونہار بیٹے راجیو کو یہ عہدہ اس وقت سونپا تھا جب انھیں کرناٹک، آندھرا، گجرات اوراڑیسہ کے انتخابات میں شکست اٹھانا پڑی تھی۔ راہل کے ذمہ دواہم کام تھے ایک تو پارٹی کوازسرنو منظم اور مضبوط بنانا اور دوسرے اپنی ماں اور کانگریسیوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کو استوار رکھنا۔ امیٹھی کے نوجوان ممبر پارلیمنٹ کا کام اپنے باپ سے زیادہ مشکل تھا کیونکہ راجیو خود تجربہ کار

تھے اوران کو ہوشیار و مستعد کارکنوں کی ٹیم کی مدد حاصل تھی نیز انھوں نے 1982 کے ایشین گیمز کے لئے دہلی میں نئی سڑکوں، ہوٹلوں اور اسٹیڈیم کے بنوانے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ راہل کو اپنی ناتجربہ کاری کے ساتھ ہر وقت ملے جلے اتحاد کے اصولوں (دھرم) کا خیال رکھنا پڑتا تھا اور وہ علاقائی لیڈروں اور پارٹیوں کے خلاف کھل کر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔

پھر بھی جہاں کہیں راہل نے تقریر کی اس پر کچھ نہ کچھ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ مثلاً 2007 میں یوپی اسمبلی کے انتخابات کے دوران انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر 1992 میں ان کا گھرانہ سیاست میں ہوتا تو بابری مسجد کبھی شہید نہ ہوتی۔ راہل نے سونیا جی کی کہی بات دہرائی تھی مگر اس پر ایک ہنگامہ مچ گیا۔ سونیا نے ایک تیز وتند بیان میں کہا تھا کہ اگر راجیو زندہ ہوتے تو وہ ہرگز مسجد کو شہید نہ ہونے دیتے۔ انھوں نے کہا کہ راجیو نے اپنے قتل سے ایک ماہ پہلے ان سے کہا تھا کہ اگر بابری مسجد کو گرانے کی کوشش کی گئی تو وہ اس کو بچانے کے لئے اپنی جان دے دیں گے۔ 2004 میں بابری مسجد کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے سونیا نے شیکھر گپتا کو این ڈی ٹی وی کے لئے انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ ''اُس زمانہ میں میں سیاست میں نہیں آئی تھی پھر بھی راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے صدر کی حیثیت سے میں نے اس کی مذمت میں ایک تیز وتند بیان دیا تھا۔ اس افسوسناک بلکہ شرمناک دن کو میں کبھی نہ بھول پاؤں گی۔ اس وقت مرکز میں کانگریس برسر اقتدار تھی مگر یوپی سرکار بی جے پی کے ہاتھوں میں تھی۔'' تاہم انتخابی اعتبار سے سونیا کی ان باتوں کا کوئی مفید اثر نہیں نکلا۔ حالانکہ سونیا نے حیدرآباد میں 1992 میں اس المناک واقعہ کی مشروط معافی بھی مانگی مگر 1998 کے لوک سبھا اور یوپی اسمبلی کے الکشن میں مسلم اکثریت والے حلقوں میں کانگریس کو بہت کم ووٹ مل پائے۔ خود کانگریسی اجودھیا کے معاملہ میں ایک رائے نہ تھے اور اس پر نجی گفتگو سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ نرسمہاراؤ نے اپنی کتاب ''اجودھیا'' میں راجیو گاندھی پر الزام لگایا کہ انھوں نے 1989 میں غیر متنازعہ زمین کے ساتھ متنازعہ زمین پر بھی شلانیاس کی اجازت دے دی تھی۔ اس الزام پر ارجن سنگھ تو خاموش رہے البتہ فوطیدار نے یہ کہا کہ 4 دسمبر 1992 کے وزارتی جلسہ میں

میں نے ڈاکٹر منموہن سنگھ کو جو نرسمہاراؤ کی نیابت کر رہے تھے یہ کہہ کر ٹوکا'' آپ خاموش ہو جائیے۔ یہ ہم سب کا فریضہ ہے کہ متنازعہ عمارت کی حفاظت کریں۔''

پرینکا کے برعکس راہل ہندوستانی میڈیا کا سامنے کرنے سے جھجکتے ہیں۔ حالانکہ بات چیت میں وہ ہر چیز پر بڑی تفصیل سے تبادلہ خیال کرتے ہیں اور اتر پردیش میں بولی جانے والی ہندی اپنی غیر ملکی ڈگری اور ماحول کے باوجود بے تکلفی سے بولتے ہیں۔ مگر پریا سہگل اسٹنٹ ایڈیٹر 'انڈیا ٹوڈے' کا جو سینٹ اسٹیفنس کالج میں راہل کی ہم عصر رہ چکی ہیں، بیان ہے کہ میڈیا ان کی شرم و جھجک کے باوجود ان کو ہمیشہ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ امیٹھی سے لوک سبھا کے لئے چنے گئے اور ان کو سرکاری بنچوں کی آٹھویں کونے والی نشست ملی تو میڈیا نے بار بار لوک سبھا کی کاروائیوں میں ان کو دکھایا حالانکہ وہ کچھ بول نہیں رہے تھے۔ جب وہ لوک سبھا میں پہلی بار بولنے کھڑے ہوئے تو صدر کانگریس سمیت ہر کانگریسی ممبر یہ چاہتا تھا کہ وہ بہترین تقریر کریں۔ اس روز راہل صاف شفاف کرتہ پاجامہ پہنے، ہنسی مذاق کرتے نمایاں نظر آرہے تھے۔ پریا سہگل نے یہ بھی کہا کہ میں نے راہل میں ایک کامیاب سیاست دان کی دو اہم خوبیاں دیکھیں، ایک تو وہ تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ہیں اور دوسرے وہ ہر معاملہ میں قابل رشک معلومات رکھتے ہیں۔''

چودھویں لوک سبھا میں 28 نوجوان ممبر منتخب ہوئے جن کے پاس غیر ملکی یونیورسٹیوں کی ایم بی اے، ایم فل، قانون وغیرہ کی ڈگریاں تھیں اور وہ عمدہ موٹر کاروں میں پارلیمنٹ آتے تھے۔ جلد ہی راہل اس نوجوان گروہ کے سرغنہ بن گئے۔ اس ٹیم کے ممبروں میں ملند دیورا، جتین پرشاد، سچن پائلٹ، سندیپ دکشت، تیجیشوانی سیر امیش، دیپندر سنگھ ہڈا، ایل راجا گوپال، مدھو گوڑ دیکشی، جیوتر آدتیہ سندھیا وغیرہ شامل تھے۔ اتر پردیش کے اسمبلی کے الکشن میں اس ٹیم کے ارکان نے انتخابی مہم کا نظم کیا اور اس کام میں ان کی مدد ستیش شرما، کشوری لال، گرجا شنکر پانڈے وغیرہ نے کی اور راہل کی نقل و حرکت اور جلسوں جلوسوں میں شرکت کے لئے متعین پروگرام تیار کیا۔

کانگریس تنظیم میں راہل کو یوتھ کانگریس، نیشنل اسٹوڈنٹس یونین آف انڈیا اور سیوا دل کو منظم اور

باعمل بنانے کا کام سونپا گیا۔ یوتھ کانگریس نے 1976 اور 1981 کے درمیان سنجے گاندھی کی قیادت کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ کمل ناتھ جو بعد میں مرکزی وزیر ہوئے اس کے ایک اہم رکن تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ یوتھ کانگریس کے بنائے 5 اصولوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی اور سنجے گاندھی نے نوائیڈا جیسی اجاڑ جگہ کو ایک پررونق اور اہم مرکز میں بدل دیا۔

مگر یوتھ کانگریس کی نشاۃ ثانیہ کے لئے لوگوں کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں، یوتھ کانگریس کے کارکن چمچماتی موٹر کاروں، شاندار سیل فون اور منرل واٹر (معدنی پانی) کی بوتلوں سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی کارگزاریاں 10 جن پتھ کے باہر نعرے لگانے، وہاں کی پارٹیوں کے انتظام اور نجی خدمتوں کے انجام دینے تک محدود ہیں جن پر لوگ خاصی انگشت نمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

'منفعت بخش عہدہ' کا تنازعہ

23 مارچ 2006 کو سونیا گاندھی نے ایک دفعہ پھر لوک سبھا کی ممبری اور نیشنل ایڈوائزری کونسل کی رکنیت سے اخلاقی بنیاد پر استعفیٰ دے کر ہر ایک کو حیران و ششدر کر دیا۔ اس سے قبل مئی 2004 میں انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس مرتبہ یہ قدم انھوں نے اس لئے اٹھایا کہ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ پارلیمنٹ کی ممبری کے ساتھ ایک نفع بخش عہدہ پر بھی قابض ہیں۔ ضابطوں کے مطابق ہر وہ سرکاری عہدہ جس میں تنخواہ، مالی منفعت یا اور دوسری سہولتیں ملتی ہوں منفعت بخش عہدہ کہلاتا ہے اور ہندوستانی دستور کی دفعہ 102 (1) الف کے تحت کوئی بھی ممبر پارلیمنٹ یا ممبر اسمبلی حکومت ہند یا کسی ریاستی حکومت کے تحت ایسا عہدہ قبول نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر سماج وادی پارٹی کی ممبر پارلیمنٹ جیا بچن کو پارلیمنٹ کی ممبری کا نااہل قرار دیا گیا کیونکہ وہ یوپی فلم ڈیولپمنٹ کونسل کی صدر تھیں۔ ان کے ساتھ 62 اور بھی ممبر پارلیمنٹ جو زیادہ تر بائیں بازو کی پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے اسی الزام کی وجہ سے نااہل قرار دئے گئے۔ جیا بچن کو ہٹانے کا الزام مخالفین نے سونیا گاندھی پر عائد کیا جس کی انھوں نے پرزور تردید کی اور یہ کہا کہ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہیں پڑتیں۔

سونیا گاندھی کے خلاف یہ قضیہ اس وقت کھڑا ہوا جب مرکزی وزیر قانون ایچ آر بھاردواج نے پارلیمنٹ کے ممبروں کی نااہلی کے متعلق 1959 کے ایکٹ میں تبدیلیوں کے بارے میں پارلیمنٹ کے کچھ ممبروں سے بات چیت کرتے ہوئے سونیا گاندھی کی نیشنل ایڈوائزری کمیٹی کی

صدارت کا معاملہ بلاوجہ چھیڑ دیا۔ ادھر ملائم سنگھ نے جیا بچن کو بچانے کے لئے ایک آرڈیننس کے ذریعہ فلم ڈیولپمنٹ کونسل کی چیرمینی کو منفعت بخش عہدوں کی فہرست سے نکالنے کی کوشش کی، جس کی کانگریس نے مخالفت کی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس زمانہ میں گاندھی گھرانے کے بچن خاندان سے تعلقات میں تلخی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو لے کر سماج وادی پارٹی اور بھارتیہ جنتا پارٹی والے این ڈی اے نے ایک پرزور سیاسی مہم چھیڑ دی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے صدر کلام کی خدمت میں یہ عرض داشت تیلگو دیشم پارٹی کے ساتھ مل کر پیش کی کہ وہ سونیا گاندھی کو منفعت بخش عہدہ رکھنے کی بنا پر لوک سبھا کی ممبری کا نااہل قرار دیں۔ اس صورت حال میں سونیا گاندھی نے سیاسی تدبر اور ذکاوت کا استعمال کر کے لوک سبھا کی ممبری سے اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے کہا حزب مخالف یہ تصور دینا چاہتا ہے کہ کانگریس اور حکومت مجھے بچانے کے لئے پارلیمنٹ کا استعمال کر رہی ہے۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں سیاست میں ذاتی فائدہ کے لئے نہیں آئی ہوں اس لئے میں اپنے اصولوں اور پبلک زندگی کی خاطر لوک سبھا کی ممبری اور نیشنل ایڈوائزری کونسل کی صدارت دونوں سے استعفیٰ دیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ رائے بریلی کے میرے بھائی بہن اور پوری قوم میرے اس قدم کی حمایت کرے گی۔''

سونیا کے استعفیٰ سے تھوڑا پہلے منموہن سنگھ سرکار ان کو بچانے کے لئے ''منفعت بخش عہدہ'' کی نئی تعریف ایک آرڈیننس کے ذریعہ کرنے جارہی تھی اور کانگریسی ممبران چاہتے تھے کہ نیشنل ایڈوائزری کونسل کی صدارت کو منفعت بخش عہدوں کی فہرست سے نکال دیا جائے۔ مگر سونیا گاندھی نے سختی سے منموہن سنگھ کو ایسا کرنے سے روکا۔ اس وقت 10 جن پتھ میں راہل گاندھی ان کے پاس کھڑے تھے اور پرینکا ایک پچھلے دروازہ سے جھانک رہی تھیں۔ حالانکہ نیشنل کونسل کی صدارت کو قانونی ماہروں نے منفعت بخش عہدہ نہیں تسلیم کیا کیونکہ وہ اس کی کوئی تنخواہ یا کوئی مالی فائدہ نہیں لیتی تھیں۔ مگر حزب مخالف اپنے مطالبہ پر اڑا تھا کہ ان کو مرکزی کابینہ وزیر کا درجہ ملا ہوا

ہے، جو یقیناً منفعت بخش عہدہ ہے۔ نیشنل ایڈوائزری کونسل 2004 میں متحدہ محاذ کی سرکار کے مشترک پروگرام کے لئے سرکار اور عوام میں رابطہ قائم کرنے کے لئے بنائی گئی تھی جس میں مختلف فلاحی دائروں کے ممتاز اور لائق افراد شامل تھے۔ اس کے ذریعہ حکومت کو غیر سرکاری رضا کار تنظیموں، ریسرچ اداروں اور دوسرے رفاہی گروہوں سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملتا تھا اور کونسل اس پروگرام کے ترجیحی زمروں کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرتی تھی۔ ان میں جین ڈریزے، ارونا رائے، سی ایچ ہنومنتا راؤ اور مادھو چاوان جیسے غیر سیاسی، سماجی کارکن شامل تھے۔ سونیا کے استعفیٰ کے بعد 31 مارچ 2008 کو یہ کونسل ختم ہوگئی۔ اس کونسل نے دیہی ترقی گارنٹی اسکیم، معلومات اور تعلیم حاصل کرنے کے حقوق، قومی صحت اور قبائلی علاقوں کی فلاح و بہبود کے لئے موزوں قوانین بنانے میں سرکار کی مدد کی تھی۔

سونیا نے نیشنل ایڈوئزری کونسل کے ساتھ ہی تمام سماجی اور کلچرل اداروں جیسے اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ، راجیو گاندھی فاؤنڈیشن، جواہر لال نہرو میموریل فنڈ، سوراج بھون ٹرسٹ کملا نہرو ٹرسٹ وغیرہ سے استعفیٰ دے دیا۔ بر بنائے احتیاط انھوں نے اپنے دو معتمد سرکاری افسروں پی پی مادھون اور ایس وی پلّے کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ یہ دونوں افسر سونیا کی ملاقاتوں کا پروگرام بناتے، کانگریس کے جنرل سکریٹریوں کی رپورٹوں کا تجزیہ کرتے اور سونیا سے بہت نزدیک تھے۔

رائے بریلی کے ضمنی الکشن میں پرچہ نامزدگی داخل کرنے سے قبل سونیا نے الکشن کمیشن کو اپنے اثاثوں کی فہرست دی جس میں اٹلی میں ان کا آبائی مکان (13 لاکھ روپیہ) زیورات (21 لاکھ روپیہ) ریزرو بینک اور یونٹ ٹرسٹ انڈیا کے بانڈ (ساڑھے بارہ لاکھ روپیہ بینک اکاونٹ بیس لاکھ 85 ہزار، نیشنل سیونگ اسکیم (ایک لاکھ 49 ہزار روپیہ) اور پبلک پراویڈنٹ فنڈ (17 لاکھ 18 ہزار روپیہ) شامل تھے۔ اس کے علاوہ ڈیری منڈی اور سلطانپور میں دو زرعی فارم بھی تھے۔ اس طرح ان کے کل اثاثوں کی مالیت ایک کروڑ چالیس لاکھ روپیوں کے قریب تھی۔ وہ رائے بریلی سے چار لاکھ سترہ ہزار سے زائد ووٹوں سے جیتیں اور ان کے دونوں حریفوں بھارتیہ جنتا پارٹی اور

سماج وادی پارٹی کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ اس کامیابی میں راہل اور پرینکا کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اسی زمانہ میں جیا بچن بھی سماج وادی پارٹی کی طرف سے راجیہ سبھا کی ممبر منتخب ہوگئیں اور ان کی حلف برداری کے موقع پر امیتابھ بچن بھی موجود تھے۔

صدر جمہوریہ کا انتخاب

ایسا لگتا تھا کہ سیاسی تجربوں میں اضافہ کے ساتھ سونیا کو غیر متوقع چونکا دینے والے فیصلہ کرنے میں خاص لطف آتا تھا جس سے ان کے مخالفین بوکھلا کر اپنی دفاع کی تدبیروں میں لگ جاتے۔ جیسا کہ وزارت عظمٰی کے عہدہ کو ٹھکرانے اور لوک سبھا سے استعفٰی دینے کے ان کے اعلانات کے وقت دیکھا گیا۔ 2007 میں انھوں نے ملک کے سب سے بڑے عہدہ صدر جمہوریہ کے لئے ایک گمنام خاتون پرتبھا پاٹل کا نام پیش کر کے سب کو متحیر کر دیا۔ پہلے ان کی نظر شیوراج پاٹل سابق ہوم منسٹر پر پڑی جنھوں نے لوک سبھا کی اسپیکری خوش اسلوبی سے نباہی تھی اور ہمیشہ نہرو۔ گاندھی خاندان کے خیر خواہ اور وفادار رہے تھے۔ مگر یو پی اے کے حلیفوں کرونا ندھی، بائیں بازو کی پارٹیوں، لالو پرشاد یادو اور رام بلاس پاسوان نے ان کے نام کی مخالفت کی۔ کہا جاتا ہے کہ خود پاٹل نے اس سلسلہ میں ستیہ سائیں بابا کا آشیرواد بھی حاصل کر لیا تھا مگر ہوم منسٹر کی حیثیت سے ان کی بدنامی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ بہت سے نام پیش ہوئے اور ان پر غور بھی کیا گیا جن میں سوشیل کمار شنڈے، کرن سنگھ، این ڈی تیواری، شیلا دکشت، کرونا کرن، ارجن سنگھ، پرنب مکرجی وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے سب ہی اس عہدہ جلیلہ کو حاصل کرنے کے متمنی تھے اور اس کے لئے کوششیں کر رہے تھے۔

14 جون 2007 نامزدگی کی آخری تاریخ تھی۔ اس دن تک الیکٹورل کالج بلکہ ملک کی سیاسی فضا میں بڑی ہلچل اور دہلی میں بڑی گہما گہمی اور چہل پہل ہوگئی تھی۔ اس وقت سونیا کے زرخیز دماغ میں ایک خیال یہ آیا کہ کیوں نہ کسی خاتون کو صدر جمہوریہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مہاراشٹر کی رہنے والی

گورنر راجستھان پرتبھا پاٹل کا نام تجویز کردیا۔ اس انتخاب نے حزب مخالف کی صفوں میں کھلبلی مچادی۔ سب سے پہلے شیوسینا نے مہاراشٹر کی بیٹی کی نامزدگی کا خیر مقدم کیا۔ مگر بی جے پی عجب مخمصہ میں پھنس گئی کیونکہ وہ کھل کر کسی عورت کی مخالفت نہ کرسکتی تھی۔ سونیا نے اٹل بہاری سے رابطہ قائم کیا اور کہا ''اٹل جی میں پہلی بار آپ کا تعاون مانگ رہی ہوں۔'' مگر سابق وزیراعظم نے یہ کہہ کر ان کی درخواست نامنظور کردی ''آپ نے دیر کردی''۔

پرتبھا کی نامزدگی پر بہت سے مرد کانگریسی وزیروں اور لیڈروں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ظاہر ہے اس میں حسد اور آپس کی رقابت کا جذبہ کام کررہا تھا۔

مگر بھارتیہ جنتا پارٹی نے پرتبھا کے ماضی کو کرید کران پر کچھ مالی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کے الزام ڈھونڈھ نکالے اور ان کی تشہیر میڈیا کے ذریعہ کی۔ اس کے ایک اہم صحافی لیڈر ارون شوری نے تو ایک کتاب ''کیا کوئی بدنام شخص صدر جمہوریہ ہوسکتا ہے'' لکھ ڈالی جس میں پاٹل پر دو الزامات لگائے گئے۔ ایک تو یہ کہ ان کے قائم کردہ مہیلا سہکاری بینک کا لائسنس ریزرو بینک نے مالی بدعنوانیوں اور غلط کاروباری فیصلوں کی بنا پر منسوخ کردیا تھا۔ پرتبھا پاٹل کچھ دنوں تک اس بینک کی ڈائرکٹر اور چیئرمین بھی رہی تھیں۔ مگر اس سلسلہ میں ریزرو بینک کی رپورٹ میں ان کا نام تک نہیں آیا اور نہ ان پر کوئی ذمہ داری عائد کی گئی۔ دوسرا الزام یہ تھا کہ گورنر راجستھان ہونے سے پہلے وہ مہاراشٹر کی ایک کوآپریٹو شکر فیکٹری کی ڈائرکٹر اور چیئرمین تھیں جو نشیلی دواؤں کا کاروبار کرتی تھی اور اس نے کسی بینک سے سترہ کروڑ قرض لے کر واپس نہیں کیا تھا، چنانچہ اس بنا پر بینک نے اس کو مہر بند کروادیا تھا لیکن ان کے بھائی نے اپنا اثر استعمال کرکے پھر اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ مگر شرد پوار نے اس الزام کی پرزور تردید کی اور کہا کہ قحط سالی کی بنا پر بہت سی کوآپریٹو سوسائٹیوں نے وقت پر قرض کی قسط جمع نہیں کی۔ اسی طرح ایک قتل کے معاملہ میں ان کے بھائی کا نام ملوث کیا گیا، ارون جیٹلی نے اس سلسلہ میں کچھ رپورٹیں شائع کیں۔ مگر الزامات کا معقول ثبوت نہ پیش کرسکے۔

بہرحال اسے حالات کی ستم ظریفی کہنا چاہیے کہ سونیا گاندھی اور بائیں بازو کی پارٹیوں نے محض

عورت ہونے کی بنا پر پرتبھا پاٹل کا نام صدارت کے لئے منظور کرلیا اور ان کی بحیثیت وزیر صحت حکومت مہاراشٹر، حفظان صحت کے بارے میں غیر متوازن تقریروں اور سیاسی غلطیوں کو نظر انداز کردیا۔ اسی طرح گورنر راجستھان بننے کے بعد انھوں نے ٹیلی ویژن پر ماؤنٹ آبو کے مذہبی گرو لیکھ راج کی روح سے بات چیت کرنے کا دعویٰ کیا جس پر تعلیم یافتہ طبقوں اور دانشوروں نے ان کی ضعیف الاعتقادی پر نکتہ چینی کی۔ بہرحال ان کی نامزدگی کے بعد بھی ان کی اہلیت پر چہ میگوئیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ صدر جمہوریہ ہو جانے کے بعد ان کے بیٹے نے جنوبی امریکہ صدارتی وفد کے ساتھ جا کر امریکہ میں اپنے ذاتی کاموں کو سرکاری خرچ پر انجام دیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ صدر جمہوریہ کا وفد میکسیکو گیا اور اس میں صدر کے بیٹے راجیند رسنگھ شیخاوت بھی شامل تھے۔ وہ وہاں سے امریکہ کی فلوریڈا یونیورسٹی 36 گھنٹہ کے لئے کسی کو بتائے بغیر چلے گئے۔ یونیورسٹی نے کچھ عرصہ پہلے انھیں فلوریڈا آنے کی دعوت دی تھی۔ اس سے بڑھ کر گڑبڑ یہ ہوئی کہ ہندستانی سفارت خانہ کا ایک افسر بھی صدر جمہوریہ کے بیٹے کی غیر سرکاری مصروفیات میں ان کی دیکھ بھال کے لئے متعین کیا گیا اور یہ سارے اخراجات ملک کے ٹیکس دہندگان کو دینا پڑے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ راجندر سنگھ کو وفد کے سرکاری افسران کو ملنے والے روزمرہ الاؤنس کا 25 فی صد سفارت خانہ نے ادا کیا۔ اس واقعہ پر یوپی اے سرکار کے حلیفوں خاص کر بائیں بازو والی پارٹیوں نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

اس طرح سونیا پرتبھا پاٹل کو راشٹرپتی بھون بھیجنے میں تو کامیاب ہو گئیں مگر یہ واقعہ بھی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا کہ وہ ایک متنازع فیہ امیدوار سمجھی گئیں اور ایک خاتون کی جیت کا خاطر خواہ فائدہ کانگریس اور متحدہ ترقی پسند محاذ کی حکومت کو نہ مل سکا۔

دوستانہ رنجش کی کہانی

2005-2006 میں منفعت بخش عہدہ کا جو جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جس میں سونیا گاندھی نے اپنی لوک سبھا کی سیٹ سے استعفیٰ دے دیا تھا اس سے گاندھی اور بچن گھرانوں کے دس سال سے چل رہے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ اس جھگڑے میں پہلے امیتابھ بچن کی بیوی کو راجیہ سبھا کی ممبری سے نااہل قرار دیا گیا اور پھر سونیا نے لوک سبھا سے استعفیٰ دیا۔ دونوں اہم خاندانوں نے ایک دوسرے پر اعتماد شکنی اور کردار کشی کے الزامات لگائے۔ اس کہانی کا آغاز تقریباً 60 سال قبل 1942 میں ہوا جب امیتابھ بچن کے والد ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن کے آنند بھون سے تعلقات شروع ہوئے اور سروجنی نائیڈو نے ان کو اور ان کی بیوی تیجی بچن کو آنند بھون پنڈت نہرو اور اندرا جی سے ملوایا۔ اندرا کی اس وقت تک شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعہ کو ہری ونش رائے نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں بھی لکھا ہے۔ خالد محمود کی کتاب ''ٹو بی آر ناٹ ٹو بی'' میں امیتابھ بچن نے اپنے والدین کی شادی کو اندرا- فیروز گاندھی کی شادی کے مماثل بتایا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''یہ الٰہ باد میں ایک کائستھ نوجوان کی ایک سکھ لڑکی سے پہلی شادی تھی جسے میرے نانا نے بالکل پسند نہیں کیا۔ ایسا ہی اندرا جی اور فیروز گاندھی کی شادی میں ہوا جسے جواہر لال پسند نہیں کرتے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے میرے والدین کو پنڈت نہرو اندرا جی، وجے لکشمی اور ان کی بیٹیوں سے ملایا اور دونوں خاندانوں میں دوستانہ تعلقات شروع ہوئے۔ میری ماں لاہور کی خوبصورتی، کلچر اور فیشن کا نمونہ تھیں اور ان کو آنند بھون کے مکینوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا''۔ تقریباً یہی بات مسز اندرا گاندھی نے اپنی

قریبی دوست ڈوروتھی نارمن کو ایک خط میں 22 راگست 1982 میں لکھی۔''بچن جوڑے کو 1942 میں سروجنی نائیڈو نے میرے والد اور مجھ سے ملوایا۔ میرے اور تیجی بچن دونوں کے دو بیٹے ایک دوسرے کے ہم عمر تھے اور ان کی پرورش دہلی میں ہوئی۔ تیجی کا بڑا لڑکا امیتابھ بچن ایک مشہور فلم ایکٹر بن گیا۔ میں امریکہ کے دورہ پر لاس اینجلز میں تھی کہ مجھے اس کے زبردست ایکسیڈنٹ اور خراب حالت کی اطلاع ملی۔ ان کو دیکھنے راجیو بذریعہ ہوائی جہاز گئے اور واپسی پر میں اور سونیا بمبئی کے ایک اسپتال میں ان کو دیکھنے گئے جہاں وہ موت سے لڑائی لڑ رہے تھے۔''

سونیا کو بھی ان تعلقات کی تلخی پر دلی صدمہ ہوا۔ کیونکہ جب وہ راجیو سے شادی کے سلسلہ میں 13 جنوری 1968 کو ہندوستان آئیں تو پالم کے ہوائی اڈہ پر ٹھٹھرتی ہوئی صبح کو ان کا خیر مقدم امیتابھ ہی نے کیا اور پھر وہ 43 دن تک ان کے گھر میں ان کی ماں تیجی اور والد ہری ونش رائے بچن کی مہمان رہیں۔ انڈیا گیٹ لان پر گھومنے اور تفریح کرنے راجیو گاندھی، سنجے، سونیا، امیتابھ اور اجیتابھ بچن، جایا کرتے تھے اور مل کر آئس کریم کھاتے تھے۔ سونیا نے 1985 کو رسالہ دھرم یگ کو ایک انٹرویو دیتے کہا''ممی (مسز اندرا گاندھی) نے مجھے بچن خاندان میں ٹھہرایا تاکہ میں ہندوستانی کلچر اور رسم ورواج سیکھ سکوں۔ میں تیجی کو اپنی تیسری ماں سمجھتی ہوں اور امیتابھ اور اجیتابھ کو بھائی۔ ہم لوگ گھر میں بیٹھ کر موسیقی، آرٹ، ہوابازی اور کاروبار کی باتیں کیا کرتے تھے اور پکنک، لمبی ڈرائیو، فلم دیکھنے نکل جاتے اور ہنسی خوشی اپنا وقت بتاتے تھے''۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں گھرانوں میں کتنے گہرے اور شگفتہ تعلقات تھے۔ سونیا کی شادی میں مہندی کی رسم تیجی بچن کے گھر میں ادا ہوئی تھی اور تیجی نے ہندو ماں کی طرح شادی کی رسومات ادا کی تھیں، تیجی سے اندرا گاندھی کی بڑی دوستی تھی۔ جب جواہر لال نہرو کا انتقال ہوا تو تیجی ہی نے دل شکستہ اندرا کو تسلی اور دلاسہ دیا تھا۔ 1973 میں اندرا نے تیجی کو فلم فنانس کارپوریشن کا ڈائریکٹر بنایا جس کا مقصد اچھے قسم کی معیاری فلموں کو تیار کرنا تھا۔ ایمرجنسی کے بعد جب نہرو خاندان 12 ولنگڈن کریسنٹ میں رہنے لگا تو اس کا پڑوسی بچن گھرانہ ہی تھا۔ امیتابھ بچن کو بھی

راجیو سے بچپن کی دوستی خوب یاد ہے۔ جس کے بعد راجیو اور سنجے تعلیم کے لئے دون اسکول بھیجے گئے اور امیتابھ اور اجیتابھ نینی تال۔ پھر بھی چھٹیوں میں یہ دوست بڑی گرمجوشی سے ملتے۔ پھر ان کا ساتھ کیمبرج میں بھی رہا اور ہوابازی کا شوق بھی دونوں میں مشترک تھا۔ تین مورتی ہاؤس میں اندرا گاندھی اور تیجی کے لڑکے اور محمد یونس کے صاحبزادے مل کر خوب کھیلتے اور کودتے تھے۔ امیتابھ بچن نے جب بمبئی کی فلم انڈسٹری میں قدم رکھا تو ان کی مدد اور سرپرستی مزاحیہ اداکار محمود نے کی۔ چنانچہ ایک دفعہ راجیو ان سے ملنے محمود کے فلیٹ پر پہنچے اور انھوں نے غلط فہمی میں راجیو کو اپنی اگلی فلم میں پارٹ کرنے کے لئے کچھ روپیہ بھی دینے کی کوشش کی۔ امیتابھ بچن کی فلمی شہرت کے بعد بھی راجیو برابر ان سے ملتے رہے۔ اور جب اندرا جی کے قتل کے بعد راجیو گاندھی کو ملکی سیاست میں نمایاں کردار ادا کرنا پڑا تو انھوں نے ان سے تعاون کی درخواست کی، چنانچہ ان کے کہنے پر امیتابھ نے الٰہ آباد سے لوک سبھا کے لئے الکشن لڑا اور کانگریس کے باغی ایچ این بہوگنا کو بھاری اکثریت سے ہرایا۔ مگر امیتابھ بچن کو سیاست میں کچھ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ راجیو کے ساتھ ان کا نام بہت سے قضیوں میں گیا مثلاً بوفورس، فیرفیکس وغیرہ۔ الزامات، جوابی الزامات اور ہتک عزت کے مقدموں کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ امیتابھ بچن راجیو اور سونیا کی مرضی کے خلاف سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس کے بعد بھی دونوں گھرانوں میں اچھے تعلقات رہے۔ پرینکا اور راہل امیتابھ بچن کو ماموں کہہ کر پکارتے تھے۔ راجیو کے قتل کے بعد سونیا اپنے بچوں کے معاملہ میں امیتابھ بچن پر اعتماد کرتی تھیں۔ امیتابھ نے راجیو کے کریا کرم کے انتظامات کئے اور سونیا اور ان کے بچوں کو دلاسہ دیا۔ انھیں راجیو کے دفعتاً اٹھ جانے سے بڑا صدمہ ہوا۔ 1991 سے 1992 میں امیتابھ بچن ان لوگوں میں آگے آگے تھے جنھوں نے سونیا کو سیاست میں آنے سے منع کیا۔ جب ان سے سیاست میں سونیا کی مدد کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ وہ خود سمجھدار اور باصلاحیت خاتون ہیں ان کو میری مدد کی کیا ضرورت ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد دہلی کے حلقوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ دونوں خاندانوں میں

روپیہ پیسہ کے معاملات اور آپس میں شادی بیاہ کے معاملات پر اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی فرد نے ان معاملات پر زبان نہیں کھولی۔ نزدیکی حلقوں کا کہنا تھا کہ اختلاف کی بڑی وجہ امیتابھ بچن کارپوریشن لمیٹیڈ کے معاملات تھے جس پر مستزاد انانیت اور اپنی شخصیت کا احساس تھا۔ تیجی کی شدید علالت کے شروع ہونے تک تعلقات غنیمت رہے۔ پھر ان میں کمی آتی رہی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ایمرجنسی اور اندرا گاندھی کی شکست کے بعد سنجے نے ان کی حمایت میں کی جانے والی ریلی میں امیتابھ کو شرکت کی دعوت دی جس کو تیجی نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اس سے ان کے فلمی کیریر کو نقصان پہنچے گا۔ حالانکہ سنجے اور امیتابھ سے بے تکلفی کے تعلقات تھے اور امیتابھ کی شادی میں انھوں نے گاندھی خاندان کی طرف سے شرکت کی تھی۔ اندرا گاندھی اور تیجی کے اٹھ جانے کے بعد ان خاندانوں میں دوری برابر بڑھتی گئی۔ امر سنگھ سے دوستی اور اس سے بڑھ کر پریزنکا کی شادی سے ایک روز قبل امیتابھ کی بیٹی شویتا کی شادی نے آپس کے تعلقات کو بڑا تلخ اور ناخوشگوار بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شویتا کی شادی چٹ منگنی پٹ بیاہ کے طور پر، پریزنکا کی شادی اور اس کی چہل پہل اور اہمیت کو کم کرنے کے لئے ایک دن پہلے رچائی گئی۔ جس میں گاندھی خاندان کا کوئی فرد شامل نہیں ہوا۔

1999 میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ابھیشیک بچن کی فلم ریفیو جی کے خاص شو کا اہتمام ہوا جس میں سونیا کو بھی مدعو کیا گیا۔ جس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ صدر کانگریس ایسی پارٹیوں اور شو میں شریک نہیں ہو سکتیں جو سادہ زندگی اور اعلیٰ تخیل کے تصور کے خلاف ہوں۔ اس جواب نے کشیدگی کو اور بڑھا دیا۔ بعض لوگ امر سنگھ کو اس اختلاف کا بانی بتاتے ہیں مگر امر سنگھ نے ہمیشہ اس الزام کو غلط بتایا۔ حالانکہ امر سنگھ امیتابھ بچن اور ان کے خاندان سے بہت زیادہ گھل مل گئے تھے اور انھوں نے امیتابھ کی دفاع میں کانگریس حکومت کو متنبہ کیا تھا کہ وہ امیتابھ یا اس کے خاندان کو تنگ کرنے کی کوئی کارروائی نہ کریں۔

اس سلسلہ میں جیا بچن نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے جب بھی موقع ملا نہرو۔ گاندھی خاندان

کو ہدف تنقید بنایا اور امیتابھ بچن کے سیاسی کردار کو اپنی طاقت بڑھانے کے لئے استعمال کیا۔ 1984 میں الہ باد کے الکشن میں جیا نے امیتابھ کے لئے ووٹ الہ آباد کی بہو ہونے کے رشتہ سے مانگے۔ آہستہ آہستہ وہ سیاسی افق پر بڑھتی گئیں اکتوبر 2004 میں انھوں نے اتر پردیش کے ساتھ مرکزی حکومت کے سوتیلے رویہ کے لئے گاندھی خاندان کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ انھوں نے ملائم سنگھ کی پرزور وکالت کرتے ہوئے کہا کہ مرکز اور کانگریس ان کے ساتھ ناانصافی کررہے ہیں۔ اپنے دیور امر سنگھ کے اصلی ٹھاکر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ووٹروں سے سماج وادی پارٹی کو ووٹ دینے کی درخواست کی اور کہا یہ لوگ اپنے وعدے اور رشتے نبھانے میں جواب نہیں رکھتے۔ جیا کے ان حملوں پر امیٹھی میں راہل نے سخت ردعمل ظاہر کیا۔ انھوں نے پرزور طریقہ پر کہا کہ گاندھی۔ نہرو خاندان نے کسی کو بھی کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ بچن خاندان والے اس معاملہ میں صریح جھوٹ بول رہے ہیں۔ امیتابھ بچن کو ہم لوگ سیاست میں لائے تھے، اب انھوں نے چولا بدل لیا ہے اور ہماری مخالفت کررہے ہیں۔ اس سخت کلامی کے خلاف امیتابھ بچن نے اپنے بیان میں کہا کہ ان کے والدین سے جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کے جو تعلقات تھے ان کے پیش نظر انھیں راہل کے جملوں سے تکلیف ہوئی اور اس سے بھی کہ میڈیا نے اس کی غلط تشہیر کرکے دونوں خاندانوں کے افراد اور بہی خواہوں کا دل دکھایا ہے۔ امیتابھ بچن نے ان تعلقات پر اپنا کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن اس کے بعد انھوں نے تلخی سے یہ سخت بات کہی ''نہرو- گاندھی خاندان نے اس ملک پر حکومت کی ہے وہ راجہ ہیں اور ہم رنک (عام رعایا)۔ اگر راجہ رعایا سے تعلقات نہیں رکھنا چاہتا تو رعایا کیا کرسکتی ہے۔'' آخر میں انھوں نے کہا کہ سونیا اور گاندھی کے جھگڑوں کی وجہ سے وہ اپنا اطمینان قلب کھونا نہیں چاہتے۔

لیکن سونیا اور ان کے گھر والوں پر جیا بچن کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مارچ 2006 میں وہ اپنی سسرال جو پرتاپ گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی گئیں۔ وہاں تقریر میں کہا کہ الہ باد کے الکشن کے بعد میرے شوہر نے سیاست چھوڑ دی، لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔

بہر حال گاندھی - بچن تعلقات اب بھی غیر یقینی اور خوشگوار نہیں ہیں۔ جولائی 2008 میں سماج وادی کے کانگریس پارٹی سے نزدیک آنے کے بعد دیکھنا ہے کہ اس کا کیا اثر ان تعلقات پر پڑتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ہندی - مراٹھی قضیہ میں جب بال ٹھاکرے نے امیتابھ بچن کی فلموں پر بندش لگانے اور شیو سینا کارکنوں نے ان کے پوسٹر جلانے کی مہم زور شور سے شروع کی تو اس کے خلاف سونیا گاندھی نے کانگریس کے چیف منسٹر مہاراشٹر کو لکھا کہ وہ امیتابھ بچن اور ان کے حامیوں کے تحفظ کا معقول بندوبست کریں کیونکہ ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ بچن خاندان مایاوتی کے رویہ کی طرف سے بھی غیر مطمئن ہے مگر کانگریس اور سماج وادی پارٹیوں کے غیر یقینی تعلقات کی وجہ سے ان معاملات میں خاموشی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ آنے والا وقت بتائے گا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

سونیا گاندھی اور کانگریس (1998 سے 2008 کے دوران)

14 مارچ 2008 کو کانگریس کے دسویں دستوری انقلاب کی برسی منائی گئی جس کی وجہ سے تنظیم کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ 1996 میں 89 سالہ بیمار اور ضعیف سیتا رام کیسری کانگریس کے صدر تھے اور کسی طرح سے صدارت سے ہٹنے پر تیار نہیں تھے۔ چنانچہ پرنب مکرجی کے گھر پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں نے جمع ہو کر ایک الٹی میٹم ان کو دیا کہ وہ صدارت چھوڑ دیں اور دوسرے ان کی جگہ پر سونیا کو صدر کانگریس بنانے کا فیصلہ کیا۔ صرف ایک وفادار ممبر طارق انور ان کا ساتھ دیتے رہے۔ پرنب مکرجی نے کیسری کی خدمات کا شکریہ ادا کیا اور یہ کہا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ اپنے غیر معمولی خصوصی اختیارات کی بنا پر کیا جس کی چھ ماہ کے اندر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس سے توثیق کرالی جائے گی۔ کیسری یہ سن کر دنگ رہ گئے، انھوں نے کہا ''ارے یہ کیا کہہ رہے ہو'' پھر مشتعل ہو کر چیخنے لگے کہ یہ جلسہ ناجائز ہے اور وہ اب بھی صدر کانگریس ہیں۔ لیکن نائب صدر جتیندر پرشاد جنھوں نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی تالیوں کی گونج میں یہ اعلان کیا کہ اب کانگریس کی صدر سونیا گاندھی ہو چکی ہیں۔ کیسری کے باہر نکلتے ہی ان کے نام کی تختی ہٹا دی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد سونیا نے کانگریس میں آکر ورکنگ کمیٹی کی صدارت کی۔

اس واقعہ کے بعد دو سال کیسری اور زندہ رہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کانگریس کی قیادت تپتے ہوئے سورج کی طرح ہے۔ بہت پاس جاؤ گے تو جل جاؤ گے اور بہت دور رہو گے تو ٹھنڈ سے مر جاؤ گے۔ ان کا انتقال 24 را کتوبر 2000 کو ہوا۔

1998 اور 2008 کے بیچ میں سونیا نے کانگریس کو کامیابی سے چلایا، انھیں کئی اُتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سیاسی اعتبار سے کامیاب نہ ثابت ہوں گی اور قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے پارٹی کو نقصان پہنچے گا۔ اور کچھ ہوا بھی ایسا ہی۔ مثلاً مہاراشٹر میں پہلے سونیا نے شرد پوار کو پارٹی سے نکال دیا مگر جلد ہی بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہرانے کے لئے ان سے ہاتھ ملا لیا۔ اسی طرح بہار میں رابڑی دیوی کی حکومت کی ذات پات کی بنیاد پر تشکیل کو غلط ٹھہرایا مگر ریاستی اسمبلی الکشن کے بعد ان سے مفاہمت کر لی۔ لیکن اس وقت بھی پرنب مکرجی اور ارجن سنگھ جیسے سینیر لیڈر سونیا گاندھی کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرتے رہے جب کہ جے رام رمیش اور کچھ اور چھوٹے لیڈران کی قیادت پر شک شبہ کا اظہار کرتے رہے۔ مگر 2004 کے الکشن اور پھر اس کے بعد 2008 کے انتخابی نتائج نے ان کو غلط ثابت کیا۔ گو یہ ضرور تھا کہ اس دوران ورکنگ کمیٹی کے جلسے بھی کم ہوئے اور صدر کانگریس نے ریاستوں کے دورے بھی کم کئے جو سونیا کے پچھلے ریکارڈ کے برعکس تھے۔ مگر ان کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ سونیا نے زیادہ وقت مخلوط حکومت کی سیاست کو قابو میں رکھنے اور حلیفوں کے باہمی اتحاد کو قائم رکھنے میں صرف کیا۔ حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں کو ورکنگ کمیٹی کے جلسوں پر ترجیح دی گئی۔ یہاں تک کہ پارٹی کا پارلیمانی بورڈ تک نہیں بنایا گیا۔ اسی طرح یوتھ کانگریس بھی غفلت اور بے عملی کا شکار رہی۔ پھر کانگریس پارٹی کو مئی 2008 کے ریاستی انتخابات میں شکست اٹھانی پڑی جس کو ملا کر 2004 سے پارٹی کی 13 ریاستی اسمبلیوں میں ہار ہوئی۔ ظاہر ہے اس کی ذمہ داری ہائی کمانڈ اور صدر کی غلطیوں پر تھی مگر کسی لیڈر نے کھل کر اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ کرناٹک کی شکست کے بعد سونیا نے اے کے انٹونی کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی جس کا کام یہ تھا کہ وہ پارٹی کو از سر نو منظم کرنے کے لئے اپنی

سفارشات پیش کرے۔ کم لوگوں کو یقین آئے گا کہ اس کمیٹی کی سفارشات پر 24 را کبر روڈ میں کوئی کارروائی اب تک نہیں کی گئی۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس سے پہلے کی رپورٹیں اور سفارشات سونیا کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ ممکن ہے اندرونی مصلحتوں کے دباؤ سے ان پر کارروائی نہ کی جاسکی ہو۔ اسی طرح جولائی 2007 میں پرنب مکرجی نے بلاک سطح پر کانگریس کمیٹیوں کو توڑ کر پولنگ بوتھوں اور اسمبلی و پارلیمنٹ کے حلقوں میں نئی کمیٹیاں بنانے کی تجویز پیش کی اور اس کے لئے متعدد ضابطے اور طریقے بھی پیش کئے۔ راہل کے دوروں نے بھی تنظیمی کمزوریوں کو بے نقاب کیا، انھوں نے معلومات کی کمی اور تال میل اور رابطہ کے فقدان کی شکایت کی۔

گزشتہ چار سال میں یہ بھی دیکھا گیا کہ وزیر اعظم منموہن سنگھ کی پالیسی عام آدمیوں کی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ پارٹی سرکار کی پالیسیوں کے کامیاب نتائج سے عوام کو باخبر نہیں کرتی۔ بلکہ بعض دفعہ پارٹی کے کارکن اور عہدہ دار حکومت اور اس کے وزیروں پر کھلے عام تنقید کرتے ہیں۔ جس سے حکومت کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ صدر کانگریس ایسی شکررنجیوں سے لطف اٹھاتی ہیں اور ان کو خاموشی سے دیکھتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں چدمبرم اور شرد پوار کی وزارتوں پر کانگریس کے لیڈروں اور جنرل سکریٹریوں نے خاصی لے دے کی۔ اسی طرح کچھ کانگریسی ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ نے بھی اپنے اوپر حملوں کا برامانا۔ کانگریس حلقے یہ بھی کہتے ہیں کہ مخلوط حکومت نے دیہی روزگار گارنٹی اسکیم اور معلومات کے حق کا ایکٹ بنا کر مفید کام ضرور کئے ہیں مگر ان پر ٹھیک سے عمل درآمد نہیں کیا جاتا اور بدعنوانیاں بھی عام ہیں۔ سونیا کے معتمد یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ صدر کانگریس کا سارا وقت بائیں بازو کی پارٹیوں اور محاذ کے تنک مزاج حلیفوں کو منانے اور سمجھانے میں لگ جاتا ہے۔ مثلاً وہ برنداکرات، سیتارام یچوری، اے بی بردھن سے ملنے میں بڑا وقت صرف کرتی ہیں دوسری طرف لالو پرشاد یادو کے ذریعہ شرد پوار اور وشواناتھ پرتاپ سنگھ کے ذریعہ ڈی ایم کے سے خوشگوار تعلقات قائم رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے ان مصروفیات میں وہ کانگریس تنظیم کی طرف کیا توجہ دے سکتی ہیں۔

اسی زمانہ میں ارجن سنگھ نے تعلیمی اداروں میں دیگر پچھڑے ہوئے طبقوں کے لئے ریزرویشن کا اعلان کر کے سرکار کے لئے نئی آفت کھڑی کر دی۔ انھوں نے وزیراعظم اور صدر جمہوریہ کی موجودگی میں تیکھے لہجہ میں ایک تقریر میں کہا، آج وفاداری کا مظاہرہ دکھاوے اور بناوٹ سے کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اندرا گاندھی اور سنجے کے کارناموں کی تعریف کی اور کہا آج کی کانگریس اپنے فیصلوں میں عوام کو شریک نہیں کرتی اسی لئے وہ اس کو مانتے نہیں۔

ارجن سنگھ کے ان فقروں اور ان کے مضمرات سے سونیا گاندھی کو ناگواری پیدا ہوئی تو انھوں نے ان کو وزارتی کونسل سے تو نہیں ہٹایا البتہ یہ کہا کہ پارٹی کے اندر فیصلے جمہوری طریقوں پر لئے جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ارجن سنگھ بھی نرم پڑے اور انھوں نے نہرو۔گاندھی خاندان سے اپنی غیر مشروط وفاداری کا اعلان کیا اور کہا کہ وہ ہمیشہ کانگریس کے ساتھ رہیں گے۔ یہ بھی کہا گیا کہ صدر کانگریس کا خیال ہے کہ ارجن سنگھ اپنی ناراضی کے باوجود منموہن سنگھ کی وزارت سے الگ ہو کر ان کی پریشانیوں میں اور اضافہ نہیں کریں گے۔ خاندان کو یہ بھی یاد آگیا کہ دسمبر 1992 میں ارجن سنگھ نے بابری مسجد کی شہادت پر مرکزی حکومت پر سخت تنقید کی تھی مگر اپنے ساتھیوں کے اصرار کے باوجود انھوں نے استعفیٰ دے کر بحران کو اور سنگین نہیں بنایا۔ اسی طرح جب صدر جمہوریہ کے لئے پرنب مکرجی کی امیدواری کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا تو انھوں نے بھی اپنی سبکی کو خاموشی سے برداشت کر لیا اور حکومت سے الگ نہیں ہوئے۔

سونیا کے لئے سب سے ٹیڑھا مسئلہ ملک کی سب سے بڑی اور اہم ریاست اتر پردیش ہے جہاں کانگریس کا اثر بہت کم رہ گیا ہے۔ کانگریسی لیڈر سونیا گاندھی کو کبھی بہوجن سماج پارٹی اور کبھی سماج وادی پارٹی سے ہاتھ ملانے کی صلاح دیتے ہیں۔ 1998 اور 2008 کے بیچ اتر پردیش کی چار سو اسمبلی کی نشستوں میں سونیا اور راہل کی مسلسل منصوبہ بند کوششوں کے باوجود 50 سیٹیں تک کانگریس کو نہ مل سکیں اور زیادہ سے زیادہ کامیابی 20-30 نشستوں تک محدود رہی۔ مسلمانوں کے

ووٹ بھی پارٹی کو کم ہی ملے۔ 2007 کے یوپی اسمبلی کے چناؤ میں کانگریس نے بے تحاشا روپیہ خرچ کیا 12 ہیلی کاپٹر چناؤ مہم کے لئے خریدے گئے، ایرکنڈیشنڈ ہوٹلوں میں سینکڑوں کارکنان کے ٹھہرنے اور بے انداز گاڑیوں کا انتظام کیا گیا، مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ حالانکہ امیدواروں کا انتخاب اور اسکریننگ ٹھوک بجا کر کی گئی مگر سو امیدواروں میں سے صرف چار ہی جیت سکے۔ 50 امیدواروں کی ضمانت ضبط ہوگئی اور کل 22 ممبر کانگریس ٹکٹ پر جیت پائے۔

سونیا پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ فیصلوں میں ایک چھوٹی سی ٹولی ہی پر بھروسہ کرتی ہیں جس کے ارکان ان کے معتمد اور مشیر کہے جاتے ہیں۔ سونیا کو بھی اس اعتراض کا علم ہے چنانچہ انھوں نے اپنے مشیروں کی تعداد میں بھی اضافہ کردیا مگر اس سے کوئی فرق نہیں محسوس ہوا، یہ معتمد اور مشیر وقت کے ساتھ بدلتے بھی رہے۔ مثلاً کئی سال قبل ایم ایل فوطیدار، نرائن دت تیواری، محسنہ قدوائی، نٹور سنگھ اور شیلا دکشت ان کے بہت نزدیک سمجھے جاتے تھے۔ 1999 اور 2000 کے بیچ اس ٹولی نے سونیا کو نقصان بھی پہنچایا۔ مثلاً مئی 1999 میں جب اٹل بہاری واجپئی کی لوک سبھا میں اکثریت نہ رہی اور کانگریس کے حق میں بھی مطلوبہ تعداد میں ممبر نہیں تھے، سونیا کو صدر جمہوریہ کے آر نارائن نے حکومت بنانے کے لئے مدعو کیا۔ انھوں نے اپنے مشیروں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے صدر جمہوریہ اور پھر ٹیلی ویژن کو یہ یقین دلایا کہ ان کو 272 ممبروں کی حمایت حاصل ہے، جب کہ واقعتاً ایسا نہیں تھا۔ سماج وادی پارٹی، فارورڈ بلاک، بی جے پی مخالف چھوٹی چھوٹی پارٹیوں نے سونیا کے غیر ملکی ہونے پر ان کے وزیراعظم ہونے کو منظور نہیں کیا۔ اس غلطی کو مخالفین نے خوب اچھالا۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ کانگریس کے دفتر میں وزیروں کے محکموں کی تقسیم، چائے اور فوا کہہ کے درمیان ہونے لگی۔ سونیا کے مشیروں کو اصل دھوکا سماج وادی پارٹی اور بی جے پی مخالف چھوٹی پارٹیوں کے رویہ سے ہوا۔ 2000 میں جتیندر پرشاد کو صدارت کے مقابلہ میں ہرانے کے بعد سونیا نے اپنے صلاح کاروں اور مشیروں میں امبیکا سونی، احمد پٹیل، جے رام رمیش، مکل واسنک اور پولک چٹرجی کو جگہ دی۔

سونیا گاندھی نے منموہن سنگھ کو راجیہ سبھا میں حزب مخالف کا قائد بنایا، مگر وہ ہر کام سونیا کے اشاروں پر کرتے تھے۔ یہ بات زیادہ تر کانگریسی لیڈروں کو پسند نہ آئی اور انھوں نے ان کی معاشی اصلاحات اور پالیسی پر اعتراضات کئے۔ ایک دفعہ تو دل برداشتہ ہوکر ڈاکٹر سنگھ نے سیاست چھوڑ کر تعلیمی شعبہ میں واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر سونیا کے سمجھانے بجھانے پر راضی ہو گئے۔ اتر پردیش میں کسی با اثر اور کارآمد شخصیت کی تلاش میں سونیا کو اس عرصہ میں خاصی پریشانی رہی۔ انھوں نے باری باری جتندر پرشاد، نرائن دت تیواری، سلمان خورشید اور ان کے بعد ارون کمار سنگھ منا (جن کی عام ساکھ اچھی نہ تھی) کو صدر بنایا۔ جس پر ہندی روز نامہ ہندوستان نے اس طرح طنزیہ سرخی دی 'ہندوستان کی تمنا اتر پردیش میں منا'۔

مگر ریاست میں کانگریس کا اثر برابر گھٹتا گیا۔ پارلیمنٹ میں 1991 سے 1996 میں یوپی سے 5 کانگریسی ممبر تھے جو 1998 میں گھٹ کر تین رہ گئے۔

کانگریس حلقوں میں نجی گفتگو کے دوران سونیا نہ تو پارٹی اور سرکار کے کاموں پر تنقید کرتی تھیں اور نہ ایک کو دوسرے سے لڑانے بھڑانے میں دلچسپی لیتی تھیں۔ لیکن ان کی نیکی اور شرافت سے ریاستی کانگریس کو انتخابی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان-امریکہ نیوکلیائی معاہدہ کے بحران میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ ان دقتوں کا سامنا کس طرح کرتی ہیں،؟ کیا وہ راہل اور پرینکا کے کرشمہ کا استعمال فراخ دلی سے کریں گی؟ بہرحال کانگریسی خوشگوار مستقبل اور اچھے انتخابی نتائج کے لئے سونیا گاندھی ہی پر تکیہ کررہے ہیں۔

نیوکلیائی سمجھوتہ: 'سیاست داں' منموہن اور 'دور اندیش' سونیا کا ظہور

سونیا کو پچھلے چھ سات سال میں خود اپنی پارٹی اور دوسروں کی مخالفت کا جس طرح کا سامنا ہندوستانی امریکہ نیوکلیائی معاہدہ کے سلسلہ میں کرنا پڑا وہ اپنی پیچیدگی اور الٹ پھیر کی وجہ سے تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ سونیا نے بڑی جرأت اور ہوشمندی سے ترقی پسند متحدہ محاذ کی حکومت کو اگست اور نومبر 2007 کے درمیان بائیں بازو کی پارٹیوں اور دوسرے سیاسی حریفوں کے حملوں اور چالوں سے بچایا ورنہ بہت سے سیاسی مبصرین منموہن سنگھ کی مخلوط حکومت کی شکست کو یقینی سمجھ رہے تھے۔ پھر جولائی 2008 میں انھوں نے اور منموہن سنگھ نے مل کر اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور تدبیر سے اپنے مخالفین کی جیتی ہوئی بازی کو الٹ دیا۔ اس مقابلہ میں انھوں نے اپنی پرانی اور قابل اعتماد بائیں بازو کی پارٹیوں کے خلاف ملائم سنگھ یادو اور امر سنگھ سے ہاتھ ملا کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ خاص کر منموہن سنگھ نے جن کو عام طور پر سیاسی معاملات میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی اس قضیہ میں نمایاں پارٹ ادا کیا۔ امریکہ سے نیوکلیائی معاہدہ کی مخالفت میں بائیں بازو والی پارٹیوں نے یوپی اے سرکار کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا، جس کی وجہ سے منموہن سنگھ کی سرکار لوک سبھا میں اقلیت میں آ گئی۔ اس وقت سونیا اور منموہن سنگھ نے ایسی چال چلی کہ ان کی پرانی دشمن سماج وادی پارٹی نے اپنے 39 ممبران پارلیمنٹ کو سرکار کا ساتھ دینے کا حکم دیا جس کی

وجہ سے 22 جولائی کو تحریک اعتماد کی ووٹنگ میں سرکار کی حمایت میں 275 ممبران نے اپنے ووٹ دیئے اور 256 ممبروں نے مخالفت میں۔ پارلیمنٹ میں اپنی حکومت کے لئے اعتماد کا ووٹ مانگنے سے قبل منموہن سنگھ نے خلاف معمول بڑے دبنگ اور جمے ہوئے لہجہ میں صحافیوں سے کہا، ''میں نے اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میری وزارت نے معاہدہ کی توثیق کردی ہے اور اب اس کے واپس لینے کا کوئی سوال نہیں۔ میں نے مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر پرکاش کرات اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر اے بی بردھن دونوں سے کہا کہ آپ جو کرنا چاہتے ہیں بخوشی کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے ناراض نہیں ہوں اور نہ میں آپ کو کچھ برا بھلا کہوں گا۔ البتہ مجھے دکھ ضرور ہے کہ اتنا عرصہ ساتھ کام کرنے کے بعد آپ ساتھ چھوڑ رہے ہیں''۔

صحافیوں کو منموہن سنگھ کے اس نئے انداز پر تعجب ہوا کیونکہ وہ اپنی مرنجاں مرنج شخصیت اور نرم و مصالحانہ رویہ کے لئے مشہور تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بائیں بازو کی پارٹیوں نے نیوکلیائی معاہدہ کو ٹھیک سے پڑھا اور سمجھا نہیں۔ وہ ہندوستان کی عزت ووقار کے بالکل خلاف نہیں ہے اور اس کے تحت ہندوستانی حکومت اپنے نیوکلیائی اسلحہ جات کے پروگرام کو بلا کسی دباؤ کے آزادی سے چلا سکتی ہے۔ انھوں نے اس الزام سے بھی شدّ و مد کے ساتھ انکار کیا کہ اس معاہدہ سے ہندوستان امریکہ کا زیردست یا محکوم بن کر رہ جائے گا۔ اس کے برعکس اس سمجھوتہ سے دونوں ملکوں میں خوشگوار اور باوقار تعلقات قائم ہو جائیں گے۔

مگر اس مسئلہ پر بائیں بازو والی پارٹیوں نے بہت سخت اور جارحانہ موقف اپنایا اور اپنی دھمکی کے مطابق منموہن سنگھ سرکار سے اپنی حمایت واپس لی۔ پھر اپنے پرانے حریفوں بھارتیہ جنتا پارٹی اور دیگر دائیں بازو کی طرف رجحانات رکھنے والی پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت کو پارلیمنٹ میں شکست دینے کا ایک جامع منصوبہ تیار کرلیا۔ اس سلسلہ میں پرکاش کرات، سیتارام یچوری نے اس معاہدہ کے نقائص اور ہندوستان کے لئے اس کے مضر اثرات کو میڈیا، عام جلسوں اور باہمی بحث و مباحثوں میں تفصیل سے پیش کیا۔ ادھر شرد پوار، لالو پرشاد وغیرہ کے بیانات اس قسم کے

نکلے کہ یہ وقت بائیں بازو کی پارٹیوں سے تعلقات بگاڑنے اور عام انتخابات کرانے کے لئے سازگار نہیں ہے۔اس سے ان کو اور تقویت ملی اور وہ خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔مگر یہاں ان کو ملائم سنگھ اور امر سنگھ کے رویہ سے سخت دھچکا لگا۔انھیں قطعی امید نہ تھی کہ ان کی حلیف سماج وادی پارٹی ووٹنگ کے وقت ان کا ساتھ چھوڑ کر معاہدہ کی منظوری کے حق میں ووٹ دے گی۔اس معاملہ میں ملائم سنگھ آخر تک منموہن سرکار کا ساتھ دینے میں تامل کرتے رہے۔ابھی تک ان کے اور امر سنگھ کے کانگریس سے تعلقات کشیدہ تھے،خاص کر امر سنگھ تو سونیا کی طرف سے ڈنر میں مدعو نہ کئے جانے پر ان سے خاص طور پر کبیدہ تھے۔مگر مزید غور وخوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اپنی دشمن مایاوتی کو نیچا دکھانے اور اتر پردیش پر قبضہ جمانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ منموہن سرکار کے اعتماد کے حق میں ووٹ دیں۔ادھر ان کے بیٹے اکھلیش اور راہل گاندھی میں بھی خوشگوار تعلقات ہو چکے تھے۔چنانچہ سماج وادی پارٹی نے جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے ممبروں کے ساتھ مل کر منموہن سنگھ سرکار کو اعتماد کے ووٹ میں جتا دیا۔بہوجن سماج پارٹی نے ووٹ دینے سے احتراز کیا۔اس دوران سونیا گاندھی تو خاموشی سے پس پردہ ہدایات دیتی رہیں لیکن سیاسی سطح پر منموہن سنگھ اور راہل گاندھی کی انتھک کوششوں نے بڑا کام کیا۔

اختتامیہ

جولائی 2008 کے بعد ملک میں عام انتخابات ہوئے جس میں سونیا گاندھی ملک کی اہم شخصیتوں میں ابھر کر سامنے آئیں۔ جس طرح اندرا گاندھی نے انڈین نیشنل کانگریس کو 1967 میں اور پھر 1971 میں بنگلہ دیش کی لڑائی جیتنے کے بعد انتخابی فتح سے ہم کنار کیا تھا اسی طرح سونیا گاندھی نے نیوکلیائی معاہدہ پر متحدہ محاذ کی حکومت کو جیت دلانے کے بعد دوسری دفعہ عام انتخابات میں کانگریس کو نمایاں کامیابی دلائی۔ یہاں ان دونوں نامور خواتین کا باہمی موازنہ مقصود نہیں۔ پھر بھی یہ تو امر واقعہ ہے کہ ان دونوں کو کانگریس کی سربراہ کی حیثیت سے بہت سی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سونیا اندرا جی کو اپنا مثالی معیار سمجھتی ہیں اور ان کی پیروی کرنے کا دعویٰ بھی کرتی ہیں مگر دونوں کے کام کرنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف رہا ہے۔ مثلاً اندرا جی پارٹی کو چلانے میں لازمی طور پر جمہوری طریقہ پر عمل نہیں کرتی تھیں۔ سونیا 1998 میں خاصے تامل کے بعد سیاست میں آئیں۔ انھوں نے اپنی ساس کی طرح کانگریس ہائی کمانڈ کو اپنے قابو میں نہیں رکھا اور اڑیسہ کے جے بی پٹنائک اور مہاراشٹر کے ولاس راؤ پٹیل کو چھوڑ کر کسی کانگریسی چیف منسٹر کو نہیں ہٹایا۔ اسی طرح اپنے مشیروں اور معتمدوں میں بھی کوئی خاص رد و بدل نہیں کیا۔ سونیا نے شیلا دکشت، بھوپیندر سنگھ ہڈا اور اشوک گہلوٹ کے وقار اور سیاسی درجہ کا خاص لحاظ رکھا جس کی وجہ سے کانگریس کو دہلی، ہریانہ اور راجستھان میں قابل ذکر کامیابی ہوئی۔

کچھ کانگریسی لیڈروں کا خیال ہے کہ طاقتور علاقائی پارٹیوں کی موجودگی اور مخلوط حکومت کی

مجبوریوں کی وجہ سے سونیا کے لئے اپنی پارٹی کے اقتدار اور مقبولیت کو قائم رکھنا آسان نہیں ہے۔ اندرا جی کے زمانہ میں کانگریس کا برہمنوں، دلتوں، اقلیتوں اور شیڈولڈ قبائل میں اہم اثر اور سماجی رتبہ تھا جس کی بنا پر ان کو الکشن جیتنے میں کچھ دشواری نہیں ہوئی۔ صرف 1977 کے الکشن میں ایمرجنسی کی غلط حکمت عملی اختیار کرنے کی وجہ سے ان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس کے برخلاف سونیا کو سیاست میں آتے ہی طاقتور بھارتیہ جنتا پارٹی کا سامنا کرنا پڑا، خود ان ہی کی پارٹی کے شرد پوار، پی اے سنگما اور طارق انور نے ان کے غیر ملکی نژاد ہونے پر ان کے خلاف ملک گیر مہم چھیڑ دی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کتنی سچی بات اپنے بارے میں کہی ''میں جواہر لال نہرو کی بیٹی تو نہ تھی جو ان کی مشکلات کا مقابلہ خوش اسلوبی سے کر پاتی جو مجھے 2004 تک جھیلنا پڑیں''۔ پھر جب ان کو اقتدار حاصل کرنے کا موقعہ ملا تو انھوں نے غیر معمولی ایثار سے کام لیتے ہوئے منموہن سنگھ کو وزیر اعظم بنا دیا۔ ایسا قدم اندرا جی ہرگز نہ اٹھاتیں اور نہ کوئی متوازی طاقت کا مرکز بننے دیتیں۔ پھر سونیا پانچ سال تک پس پردہ گمنامی میں رہ کر اپنے مخالفین کے وار سہتی رہیں۔ 2009 کے الکشن میں کانگریس نے 200 نشستیں حاصل کر کے سب کو تعجب میں ڈال دیا اور خاص کر اتر پردیش میں بھی اپنی گنوائی ساکھ ایک حد تک واپس لے لی۔ یہ بات 1998 میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

کانگریسی حلقوں کے مطابق اپنی جگہ سیاست میں راہل کو سونپنے کے معاملہ میں سونیا احتیاط اور تدبر سے کام لے رہی ہیں۔ اندرا گاندھی نے سنجے کو بہت جلد خاصے اختیارات دے دیے تھے اور ایک حد تک راجیو کو بھی۔ مگر راہل ابھی صرف پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ اور اب کانگریس کے جنرل سیکریٹری بھی بنائے گئے ہیں۔ لڑکی پرینکا کی شادی ہو گئی ہے اور ابھی تک وہ سیاست سے دوری ہی بہتر سمجھتی ہیں۔

منموہن سنگھ کا انتخاب سونیا جی نے ان کی قابلیت اور صاف ستھرے کردار کی بنا پر کیا۔ وہ جوڑ توڑ کی سیاست نہیں جانتے انھوں نے سونیا گاندھی کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ ان کو سونیا نے حزب مخالف

کا قائد بنا دیا اور مخلوط متحدہ محاذ کا وزیر اعظم۔ چنانچہ ان دونوں میں بڑا خوشگوار رابطہ اور اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ دونوں شرمیلے مزاج کے ہیں اور خوشامد بناوٹ اور جھوٹے وعدے کرنے سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ بہت سی باتوں میں سونیا جی اپنی ساس سے الگ ہیں۔ الکشن میں اکثریت کے لئے عوامی مقبولیت ضروری ہے، دیکھنا ہے 2014 میں بہو (سونیا) کیا کر دکھاتی ہیں۔ بائیں محاذ کی علیحدگی کے بعد ملک کی سیاسی صورت حال میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے، بہار اور بنگال کے آنے والے ریاستی انتخابات میں سونیا گاندھی کی کارکردگی کا عوام بے چینی اور اشتیاق سے انتظار کریں گے۔

کتابیات

اس فہرست میں ان کتابوں اور مضامین کے عنوانات شامل ہیں جن سے مصنف نے اپنے تاثرات اور کتاب کے مشمولات میں فائدہ اٹھایا ہے۔ مصنفین کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے دیے گئے ہیں۔

1۔ ایڈم، دی ڈائنسٹی نہرو اینڈ گاندھی، بی سی بکس پینگوئن، 1997

2۔ اوشا بھگت، اندرا جی تھرو مائی آئیز، پینگوئن وائسکنگ، 2005

3۔ اندرا گاندھی، وھاٹ آئی ایم، اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ، 1986

4۔ اندرا گاندھی، مائی ٹرتھ، اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ، 1981

5۔ اندرا گاندھی، لیٹرس ٹو اے فرینڈ، ٹیرن فیلڈ نکلسن لندن، 1986

6۔ اندر ملہوترا، اندرا گاندھی، اے پرسنل اینڈ پولیٹیکل بائیوگرافی، ہاڈر اینڈ اسٹاوٹن لندن، 1989

7۔ ارون شوری، دی اسیسنیشن اینڈ آفٹر، روبی بکس نئی دہلی، 1985

8۔ اسٹینلی وولپرٹ، اے نیو ہسٹری آف انڈیا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نیویارک، 1989

9۔ بھابنی سین گپتا، راجیو گاندھی اے پولیٹکل اسٹڈی، کونارک، نئی دہلی، 1989

10۔ بی۔ کے۔ نہرو، نائس گائیز فنش سیکنڈ، پینگوین بکس، دہلی، 1997

11۔ پشپا بھارتی، امیتا بھ بچن، رتو گندھا پرکاش، 1994

12۔ پال براس، دی پالیٹکس آف انڈیا: سنس انڈیپنڈنس، کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1994

13۔ پردیپ چند، اے فوٹو گرافرس ٹریبیوٹ، روپا اینڈ کو، 2006

14۔ پی. این. دھر، اندرا گاندھی-دی ایمرجنسی اینڈ انڈین ڈیماکریسی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی، 2000

15۔ پرنئے گپتا، انڈیا دی چیلنج آف چینج، منڈرا ین نیویارک، 1989

16۔ پی. وی. نرسمہاراؤ، اجودھیا، پینگوئن بکس، 2006

17۔ پی. وی. نرسمہاراؤ، ان سائیڈر، پینگوئن بکس، 1998

18۔ پی. سی. الیگزینڈر، مائی ایرس وِد اندرا گاندھی، ویژن بکس، نئی دہلی، 1991

19۔ ملی اینڈ مسانی، فرام راج ٹو راجیو، بی. بی. سی. بکس، لندن، 1988

20۔ جے. ایس. برائٹ، اندرا گاندھی، نیو لائٹ پبلشر نئی دہلی، 1984

21۔ جیسیکا ہائنس ملکنگ فار بگ بی-بالی ووڈ بچن اینڈ می، بلومسبری، 2007

22۔ جیمس میسنر، انٹو ویٹیو لیڈرشپ ان ماڈرن انڈیا، البانی نیویارک، 1993

23۔ جناردھن ٹھاکر، آل دی پرائم منسٹرس مین، وکاس نئی دہلی، 1977

24۔ جواہر لال نہرو، لیٹر فرام اے فادر ٹو ہز ڈاٹر، کتابستان الہ آباد

25۔ چڈھا، دی ٹین ایر فائل، سنچار پبلیکیشنز ہاؤس، 1992

26۔ دینا ناتھ مشرا، سونیا دی ان نون، انڈیا ٹرسٹ فاؤنڈیشن دہلی، 1991

27۔ روپا چٹرجی، سونیا مسٹیک، ساؤتھ ایشیا بکس، 2000

28۔ زویا حسن، پرائم منسٹر اینڈ دی لیفٹ، لوٹالا پبلیکیشنز نئی دہلی، 1998

29۔ راجیو سنگل، میگا اسٹار آف ہالی ووڈ میگنا گن پیپر بیک، 2004

30۔ سونیا گاندھی، راجیو، پینگوئن بکس، نئی دہلی، 1992

31۔ سونیا گاندھی، ٹو الون ٹوگیتر، ہاڈر لندن، 1992

32۔ سونیا گاندھی، فریڈمس ڈاٹر، ہاڈر لندن، 1989

33۔ ایس. ایس. گل، دی ڈائنسٹی اینڈ پولیٹکل بیاگرافی، ہارپر کالنس انڈیا، نئی دہلی، 1996

34۔ سومنت مسرا، میں امیتا بھ بچن بول رہا ہوں، اگمانٹ، 2003

35۔ سوراج پاٹل، اندرا گاندھی، رابرٹ رائس لندن، 1985

36۔ سوم دت بکھوری، دی کال آف گینجیز، وکاس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1979

37۔ ایس. ار نجشی، سونیا گاندھی-دی پریسیڈنٹ آف کانگریس، ساؤتھ ایسٹ ایشیا بکس، 1998

38۔ شوبھاڈے، سلیکٹیو میموریز-اسٹوریز فرام مائی لائف، پینگوئن بکس، 1998

39۔ طارق علی، نہروز اینڈ گاندھیز-انڈین ڈائنسٹی، پکاڈور لندن، 1991

40۔ کیتھرائن فرینک، لائف آف اندرا گاندھی، ہارپر کالنس لندن، 2001

41۔ کے.نٹور سنگھ، کاؤنٹ یور بلیسنگس، ہرانند پبلیکیشنز، 1993

42۔ گوپال، جواہر لال نہرو اے بیا گرافی، آکسفورڈ پریس، نئی دہلی، 1975

43۔ گورنمنٹ آف انڈیا، وھائٹ پیپر آف مسیوز آف ایمرجنسی، ماس میڈیا، 1977

44۔ محمود حنیف زویری، اے مین آف منی موڈس، پاپولر پرکاشن، نئی دہلی، 2005

45۔ محمد یونس، پرسنس پیشنس اینڈ پالیٹکس، وکاس، نئی دہلی، 1980

46۔ مادھوگاڈبولے، ان فنشڈ انگز، ری کلکشن آف اے سول سرونٹ، سنگم بکس، 1996

47۔ موہن دیپ، ایوریکا-انٹیمیٹ لائف آف ریکھا، شیوالی پبلیکیشنز، بمبئی، 1999

48۔ محمد خالد، ٹوبی آرنات ٹوبی، سرسوتی کریشن، 2002

49۔ منہاز مرچنٹ، راجیو گاندھی اینڈ اے ڈریم، پینگوئن بکس، 1991

50۔ نکولس نیو جنٹ، راجیو گاندھی سن آف اے ڈائنسٹی، بی بی سی بکس لندن، 2001

51۔ نیانترا سہگل، ریلیشن شپ، کاپی فارو دمن، دہلی، 1994

52۔ نرنجن کھلنانی، فور ڈائمنڈس آف آنند بھون، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، راج پرکاشن، نئی دہلی، 1987

53۔ بریکنگ سائلنس، سونیا گاندھی کروز مور وکل، ایشیا ویک، 15/ستمبر 1995

54۔ تھیوری ویز الائف بیانڈ بوفورس، انڈین اکسپریس، نئی دہلی، 4/جنوری 2000

55۔ پولیٹکل پائلٹ ہولرنٹ اے بٹ ٹو فاسٹ، گارجین، لندن، 22/مئی 1991

56۔ بریف اینکاؤنٹرس ودمسز تیجی بچن، موہن سردیا، اسکرین، بمبئی، 2/فروری 2008

57۔ اندرا گاندھی، ویدمہندرا، ٹائمس آف انڈیا، 3/فروری 1998

58۔ انڈین پولیٹیکل اکسپریس 1950 تا 1984، راج پرکاش، نئی دہلی، 1987

59۔ ایجوکیٹنگ سونیا، بھاؤ دیپ کانگ، رسالہ آوٹ لُک، 6/جولائی 1998

60۔ اے پرٹیلرس ٹیل، رسالہ سامیا، کلکتہ 2007

61۔ وھاٹ اے.سی. گپتا کمیشن سیڈ اباؤٹ سونیا، پانیر، نئی دہلی، 10/مئی 1991

62۔ اندرا گاندھی اینڈ کامرس، ارون شوری، انڈین اکسپریس، نئی دہلی، 15/مارچ 1982

63۔ ڈائنٹک رول آر ڈیموکریٹائزیشن آف پاور، تھرڈ ورلڈ کوارٹرلی، 10/جنوری 1988

64۔ سونیا گاندھی، پشپا بھارتی، دھرم یگ، 15/جون 1985

65۔ دیٹ گاندھی میجک، ٹم میگلرک، ٹائم ایشیا، 2/مارچ 1998

66۔ توتو میں-انٹرویو، پامیلا فلیپوز، سنٹر اسٹیج ٹی.وی.، 23/ستمبر 2001

67۔ ان ایشیا ڈائنسٹیز اسٹل رول، جان ایلیٹ، نیوا سٹمین، لندن، 8/نومبر 1999

68۔ سونیا گاندھی ورسز انڈیا، پانیر، نئی دہلی، یکم جون 1999

69۔ نوٹس فرام بی اسکول، مڈڈے، بمبئی، 10/اکتوبر 2006

70۔ گاندھی، ایس.سی. نیش، گارجین، لندن، 22/مئی 1992

71۔ ڈبل اسپیک، ڈیو بیس انٹنشن، پانیر، نئی دہلی، 2/فروری 1992

72۔ پی.ایم. انگریزی ان کونٹیجنڈ-نوریزن، ڈیلی ٹیلیگراف، کلکتہ، 31/اکتوبر 2007

73۔ اینگونشڈ پی.ایم. ٹولیفٹ-سو بی اٹ، ڈیلی ٹیلیگراف، کلکتہ، 11/اگست 2007

74۔ پاور پلے-سونیا سیٹ فارا اے پول والٹ، انڈین اکسپریس، نئی دہلی، 18/مارچ 2002

75۔ بالی ووڈ سینما، ٹمپلس آف ڈیزائر، رٹلج، نیویارک، لندن، 2002

76۔ ان مینو کنٹری، فرنٹ لائن، 25/اپریل 1998

77۔ ہیراز رمولا بچن، سوسائٹی میگزین، جنوری 1994

78۔ ریڈی انگ فار ریس کورس، ٹائمز آف انڈیا، دہلی، 17/نومبر 2002

79۔ فائٹ وِدراجیو-واز ناٹ ورتھ اِٹ، ٹائمس آف انڈیا، دہلی، 23/فروری 2005

80۔ شی اسٹینڈس ریمارکیبلی الون، نیویارک ٹائمس میگزین، مارچ 1996

81۔ سونیا-نولانگر دی سیوایز ڈیسنٹ اگینسٹ ہر لیڈرشپ، اشیاویک، 22/نومبر 1997

82۔ سونیاز سائلنس اینڈ امپارٹنس آف بی انگ، وِنسنٹ جارج، ایشیاویک، 22/نومبر 1997

83۔ ٹی وی ایشیا ئیڈس، ایشین ایج، 9/جنوری 1995

84۔ مسز گاندھی-مینکا اسپیٹس ول ڈوویل، تو تو میں، 23/نومبر 2001

85۔ سونیاز فرسٹ اسکینڈل، پانیر، نئی دہلی، 10/مئی 1999

86۔ لکنگ بیک ایٹ بوفورس اسکینڈل، 23/ستمبر 1999